تقسیم ہند، فسادات اور ہجرت کا تانیثی مطالعہ

(نمائندہ ناولوں کے حوالے سے)

مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی

مقالہ نگار

فرحین کوثر

نگراں

پروفیسر ایس۔ایم۔انوار عالم

(انور پاشا)

ہندوستانی زبانوں کا مرکز

اسکول آف لنگویج، لٹریچر اینڈ کلچر اسٹڈیز

جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی۔۱۱۰۰۶۷

2019

जवाहरलाल नेहरू विश्वविद्यालय
JAWAHARLAL NEHRU UNIVERSITY
भारतीय भाषा केन्द्र
CENTRE OF INDIAN LANGUAGES
भाषा, साहित्य एवं संस्कृति अध्ययन संस्थान
School of Language, Literature & Culture Studies
नई दिल्ली–110067, NEW DELHI - 110067, INDIA

Dated: 19 July, 2019

CERTIFICATE

This is to certify that Ms. Farheen Kausher, a bona-fide Research Scholar of Centre of Indian Languages, SLL&CS has fulfilled all the requirements as per the University Ordinance for the submission of Ph.D. thesis entitled *Taqseem-e-Hind, Fasadaat Aur Hijrat Ka Taaneesi Mutala (Numaainda Nawilon Ke Hawale Se) [A Feminist Study of Partition of India, Communal Riots and Migration (With Special Reference to Representative Novels)]* This may be placed before the examiners for evaluation for the award of the degree of Ph.D.

19/07/2019

Prof. S.M. Anwar Alam
(Anwar Pasha)
(Supervisor)
CIL/SLL&CS/JNU

Prof. Omprakash Singh
(Chairperson)
CIL/SLL&CS/JNU

Dated: 19 July 2019

DECLARATION

I hereby declare that the Ph.D. thesis entitled *Taqseem-e-Hind, Fasadaat Aur Hijrat Ka Taaneesi Mutala (Numaainda Nawilon Ke Hawale Se) [A Feminist Study of Partition of India, Communal Riots and Migration (With Special Reference to Representative Novels)]* submitted by me is the original research work. It has not been previously submitted for any other degree in this or any other University/ Institution to the best of my knowledge.

I further declare that no plagiarism has been committed in my work. If anything is found plagiarized in my Thesis, I will be solely responsible for the act.

Farheen Kausher

Farheen Kausher

Research Scholar

فہرست

- پیش لفظ: 03-07
- باب اول: تقسیم ہند کی سیاست اور اس کے مضمرات 08-35
- باب دوم: تقسیم ہند سے متعلق فسادات اور خواتین 36-62
- باب سوم: ہجرت اور خواتین 63-87
- باب چہارم: تقسیم ہند، فسادات اور ہجرت کا تانیثی تناظر 88-121
  (نمائندہ خاتون ناول نگاروں کے حوالے سے)
  - قرۃ العین حیدر
  - خدیجہ مستور
  - جمیلہ ہاشمی
- باب پنجم: تقسیم ہند، فسادات اور ہجرت کے تناظر میں خواتین سے متعلق 122-164
  مسائل اور مرد ناول نگاروں کا رویّہ (نمائندہ مرد ناول نگاروں کے
  حوالے سے)
  - عبداللہ حسین
  - انتظار حسین
  - عبدالصمد
- حاصل مطالعہ: 165-174
- کتابیات: 175-183

○○○

پیش لفظ

انسانی زندگی کے گوناگوں تجربات واحساسات، افکار وخیالات، مشاہدات اور حیات انسانی کی آئینہ سامانی جتنی وسعت وگہرائی کے ساتھ ناول میں پیش کیا جاسکتا ہے اتنی کسی دیگر اصناف سخن میں ممکن نہیں ہوتی۔ ناول نہ صرف فرد، خاندان اور تہذیبی اور معاشرتی زندگی کی تصویر کشی اور ان سے پیدا شدہ مختلف النوع کیفیتوں کی مکمل ترجمانی کرتا ہے بلکہ زندگی کی ازسرنو تخلیق بھی کرتا ہے۔ سماج کے عصری مسائل، داخلی وخارجی زندگی کے پیچ وخم، شکست وریخت، تخریب وتعمیر، عروج وزوال نیز تضاد وتصادم کی تمام پیچیدگیوں کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے محرکات اور مضمرات کو بھی اپنی گرفت میں لینے کی اہلیت وقوت رکھتا ہے۔

ناول نگاری کے میدان میں مردوں کے دوش بدوش خواتین ناول نگار نے بھی کارہائے نمایاں انجام دئے اور مرد ناول نگاروں کی طرح خواتین نے بھی زندگی کے پیچیدہ اور اہم مسائل کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا ہے۔ نذیر احمد اور راشد الخیری کے زیر اثر کئی خواتین ناول نگاروں نے اپنے ناولوں کے موضوعات کا دائرہ اصلاحی، سماجی، اخلاقی اور معاشرتی مسائل تک محدود رکھا تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ سماجی، سیاسی اور تہذیبی تبدیلیوں نے ان کے موضوعات ومسائل کا دائرہ وسیع کر دیا۔ جس سے ان کے ناولوں میں فنی اور فکری ہر دو اعتبار سے ارتقا کی منزلیں طے کرنے لگی۔

حصول آزادی کے بعد اردو ناول نگاری کی دنیا میں ایک نیا انقلاب ظہور پزیر ہوا۔ اور ایک طویل جدوجہد کے بعد ہندوستان آزاد تو ہوا لیکن یہ آزادی تقسیم کا المیہ بھی ساتھ لے کر آئی۔ جس نے ہماری تہذیبی زندگی کا رخ موڑ کر رکھ دیا۔ صدیوں کی باہمی معاشرت میل جول سے ہم نے دنیا کے سامنے جس کے شاندار

تہذیب کا نمونہ پیش کیا تھا ایک سیاسی اشارے کے نتیجے میں دولخت ہو کر رہ گئی۔ یہ ایک ایسا سیاسی تجربہ تھا جس سے پوری انسانیت کراہ اٹھی تھی اور انواع و اقسام کے اخلاقی، جنسی، سیاسی و معاشی مسائل نمودار ہوئے، جس سے نکل پانا دشوار ہی نہیں ناممکن سا ہو گیا۔ یہ صرف زمین پر کھنچی ہوئی ایک لکیر نہیں ہے یہ لکیر ذہنوں، دلوں اور دو تہذیبوں کے درمیان ایک خلیج کی شکل اختیار کر چکی ہے جس کے جلو میں شکوک اور اندیشوں کے مہیب سائے ہمیں ڈراتے رہتے ہیں۔ صدیوں سے ساتھ دینے والی دو قومیں ایک دوسرے اتنی متنفر کیسے ہو گئیں کی ایک ملک میں رہنا گوارہ نہیں ہوا اور نتیجے میں وہ سب ہوا جس سے انسانی تاریخ شرمسار ہے۔ تقسیم کے نتیجے میں جو لوگ ایک نئے ملک میں آباد ہو رہے تھے ان کے سامنے سب بڑا مسئلہ اپنی شناخت کا تھا جس روئے زمین پر وہ پیدا ہوئے جہاں ان کے اجداد خاک کا پیوند ہوتے رہے اچانک وہ اجنبی بن گئی۔ ہجرت کرنے والوں کو ایک اجنبی تہذیب کا سامنا تھا لہٰذا اپنے گاؤں محلے اور کھیت کلیان کی یاد یہاں سے جانے کے بعد ان کا مستقل درد بن گئی۔ ان سب کے ساتھ ہجرت کے دوران انسانیت کے جس ننگے ناچ کا تجربہ ان کو ہوا اس نے انسانی رویے پر ہی سوالیہ نشان قائم کر دیا۔ دو مملکت کی تشکیل، نقل آبادی اور فسادات نے دونوں ملکوں کی معیشت کو بری طرح متاثر کیا۔ فرقہ پرستی کی آگ میں کتنے خاندان ختم ہو گئے، کتنے گھر جلا دئے گئے، عورتوں کے ساتھ وحشیانہ سلوک کیا گیا، اس موضوع پر اردو میں متعدد ناول اور افسانے لکھے گئے ہیں۔ اس تباہی میں سب سے زیادہ مار 'عورت' نے سہی ہے۔ کیونکہ اس ملک میں زمین کی طرح عورت بھی مرد کی ملکیت سمجھی جاتی ہے۔ جو بیچی اور خریدی جا سکتی ہے۔ پیدا ہونے سے پہلے ماردی جاتی ہے۔ ایک شوہر جب چاہے صرف تین بول ادا کر کے ساری زندگی اسے دوزخ کی آگ میں جھونک سکتا ہے۔ اسے اپنی پاکدامنی ثابت کرنے کے لئے اگنی پریکشا سے گزرنا پڑتا ہے۔ پھر زمیں میں سما جانا ہے۔ انتقام کی آگ میں پاگل ہو جانے والے مرد نہ ہندو تھے اور نہ مسلمان۔۔۔ وہ صرف ظالم تھے، جو عورتوں پر جبر کر کے اپنی ہوس کی آگ بجھا رہے تھے عورتیں اپنے خاندان سے بچھڑ گئیں۔ انہیں زبردستی دوسرا مذہب اختیار کرنے پر مجبور کیا گیا۔ جس عورت کی عزت لوٹی گئی اس کو یہ نہیں معلوم تھا کہ جن مردوں نے اس کی عزت لوٹی ان میں اس بچے کا باپ کون ہے جو اس کی کوکھ میں پل رل رہا ہے۔ اس عورت کا دکھ کیا ہوگا جو اپنے دشمن کی اولاد کو دودھ پلا رہی ہے۔

اس عظیم سانحہ پر اردو میں بہت سے افسانے اور ناول لکھے گئے۔جنہیں دنیا کے بہترین ادب میں شمار کیا جاتا ہے۔ان حالات وواقعات نے ادیبوں اور شاعروں کو بھی متاثر کیا اور ادبی شہہ پارے عالم وجود میں آئے۔اس کا اظہار کرنے کے لئے ادیبوں نے ناولوں اور افسانوں کو وسیلہ بنایا۔معاشرے، ملک وقوم کی سچی کیفیت اور عورتوں پر ہورہے مظالم کا بیان ناولوں کے ذریعہ بھی کیا جانے لگا۔ادیبوں نے اپنے خیال کا اظہار اپنے فن کے ذریعہ کیا۔قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں وہ عورت شامل ہوئی جو جذباتی اور ذہنی طور پر طاقت ور ہے، جو مرد اور مرد کی دنیا، دونوں کے ساتھ بلا جھجک قدم بڑھا رہی ہے۔قرۃ العین حیدر نے ناولوں کو عورت کے ایسے کردار دئے جو دنیا کی تہذیب کو اور ان کی تبدیلیوں کو سمجھتی ہے۔وہ صاحب رائے اور عالمی ادب اور تاریخ پر نظر رکھتی ہے۔ایسی عورت جو ایک طرف زندگی کی رفتار میں شریک ہے اور دوسری طرف اپنی ذات کے دکھ اور خاندان ومعاشرے کے دباؤ کو بھی سہتی ہے۔'آگ کا دریا'، 'میرے بھی صنم خانے' اور 'آخر شب کے ہم سفر' اسی قبیل کے ناولیں ہیں۔وہیں عصمت چغتائی کے یہاں عورت سماج سے بغاوت نہیں کرتی۔وہ مذہب اور سماج کے اصولون کو توڑ کر اپنے ناول کے کسی عورت کو آگے نہیں بڑھاتیں۔تقسیم ہند، فسادات اور ہجرت کے موضوع پر لکھے گئے ناولوں میں خدیجہ مستور، جمیلہ ہاشمی، جیلانی بانو نے صرف ملک کی ہی آزادی نہیں بلکہ عورتوں کے اور ان کی آزادی اور عظمت کو بھی اپنے ناولکا موجوع بنایا ہے۔انتظار حسین، حیات اللہ انصاری، عبدالصمد، قدرت اللہ شہاب، بیدی،عبداللہ حسین، رامانند ساگر، کرشن چندر،شوکت صدیقی، بانو قدسیہ، رضیہ فصیح احمد، قاضی عبدالستار جیسے اہم ناول نگاروں نے تقسیم کے بعد برصغیر اور خاص طور سے اپنے اپنے ملک کی سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی سطح پر رونما ہونے والی تبدیلیوں کی نہ صرف نشاندہی کی ہے بلکہ اپنے ناولوں کو نئے تقاضوں سے ہمکنار بھی کیا ہے۔جاگیردارانہ عہد اور مشترکہ تہذیب کا زوال، تقسیم ہند کے جلو میں ہونے والے فسادات اور ہجرت کا کرب، بے زمینی کا احساس، اپنے مظبوط جڑوں سے اکھڑنے کا حادثہ اور متوسط طبقے کی کشمکش ومسائل اور عورتوں کے ظلم وتشدد کو بڑے ہی فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔انہوں نے اپنے ناولوں میں موضوعات، مسائل، فکروفن، تکنیک کے تجربات اور کردار نگاری کی سطح پر نئے رجحانات اور نئی جہتوں کو روشناس بھی کیا ہے۔

اس مقالے میں تقسیم ہند، فسادات اور ہجرت کے عظیم وتاریخی سانحے سے متعلق ناول نگاروں کے

نمائندہ ناولوں کا تانیثی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ جو سماجی، سیاسی، معاشی، نفسیاتی اور تہذیبی اعتبار سے نمائندہ ناول قرار دئے جاسکتے ہیں۔ اگر چہ آزادی کے بعد برصغیر کے ناول نگاروں کی ایک بڑی تعداد سامنے آتی ہے۔ جنھوں نے فسادات و ہجرت کے کربناکیوں، بالخصوص عورتوں کے مسائل اور ان پر ہونے والے ظلم وزیادتی کی نہایت عمدہ اور حقیقی ترجمانی کی ہے۔ لیکن ان سب کو اپنے مقالے میں شامل کرنا ممکن نہیں تھا۔ لہٰذا تقسیم ہند کے بعد برصغیر کے مرد اور خواتین ناول نگاروں کے نمائندہ ناولوں کو ہی موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

یہ مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول میں تقسیم ہند کے پس منظر کا جائزہ لیا گیا ہے نیز تقسیم ہند کے پیچھے کارفرما سماجی، سیاسی اور تہذیبی عوامل کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔

باب دوم میں تقسیم ہند کے جلو میں پھوٹ پڑنے والے فسادات کی زد میں عورتیں کس طرح آئیں، انھیں کون سے مسائل درپیش رہے، کس طرح کی صعوبتیں اٹھانی پڑیں، ان تمام حادثات و واقعات کا تفصیلی مطالعہ نمائندہ ناولوں کے حوالے سے ان کا جائزہ لیا گیا ہے۔

باب سوم میں ہجرت کے المناک واقعہ کے تحت عورتوں کی دربدری، اپنوں سے بچھڑنے کا غم، سونی مانگ اور اجڑی گود کی ٹیس کا تجزیہ نمائندہ ناولوں کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ناول نگاروں کی ذاتی کرب اور تکالیف کی روشنی میں ان کے تجربات واحساسات اور افکار وخیالات کو ان کے ناولوں کے حوالے سے پیش کیا گیا ہے۔

باب چہارم میں تقسیم ہند، فسادات اور ہجرت کے مکمل منظرنامے کا مطالعہ تانیثی تناظر میں کیا گیا ہے، علاوہ بریں خاتون ناول نگاروں کا اس دلدوز واقعہ پر کیا رویہّ رہا بالخصوص عورتوں کے حوالے سے کہ کس طرح وہ اس عظیم سانحہ سے متاثر ہوئیں۔ جنس کی بنیاد پر انکے ساتھ کیا امتیازی سلوک روا رکھا گیا اور کس طرح ان کا استحصال کیا گیا۔ ان تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ قروۃ العین حیدر، خدیجہ مستور اور جمیلہ ہاشمی کے نمائندہ ناولوں میں ان اثرات واستحصال کا جائزہ لینے کی سعی کی گئی ہے

باب پنجم میں تقسیم ہند، فسادات اور ہجرت کے مکمل منظرنامے کا مطالعہ تانیثی تناظر میں کیا گیا ہے، نیز برصغیر کے مرد ناول نگاروں کا اس دلدوز واقعہ پر کیا رویہّ رہا خاص طور پر عورتوں کے حوالے سے کہ

عورتیں کس طرح اس عظیم سانحہ سے متاثر ہوئیں۔جنس کی بنیاد پر انکے ساتھ جو امتیازی سلوک روا رکھا گیا اور ان کا استحصال کیا گیا کیا وہ اس حیثیت و مقام کی حقدار تھیں۔ان تمام پہلوؤں پر عبداللہ حسین، انتظار حسین اور عبدالصمد کے احساسات و تجربات کو پیش کیا گیا ہے۔

حاصل مطالعہ کے تحت میں نے اپنے تحقیقی کام کا خلاصہ پیش کیا ہے۔اور ہر باب کے آخر میں حوالے دئے گئے ہیں۔

اس مقالے کی تیاری میں اپنے استاد مکرم پروفیسر ایس ایم انوار عالم (انور پاشا) صاحب کی بے حد ممنون ہوں جن کی رہنمائی اور گراں قدر مشورے کے بغیر مقالے کو پایہ تکمیل تک پہنچانا غالباً میرے لئے ممکن نہ تھا۔اپنے شعبے کے دیگر اساتذہ کی بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے وقتاً فوقتاً اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔ اس کے علاوہ میں اپنے پروفیسر جناب احمد حسن دانش صاحب کی بھی بے حد مشکور ہوں جنہوں نے یونیورسٹی آنے سے قبل امتحان کی تیاریوں میں میری بہت مدد کی اور ہر قدم پر میری حوصلہ افضائی اور اصلاح کا فریضہ ادا کرتے رہے۔اپنے مرحوم والد محترم جناب عبدالمنان کی میں تاعمر احسان مند رہوں گی جن کی دعاؤں اور کوششوں نے مجھے آج اس مقام تک پہنچایا ہے۔میں اپنی والدہ محترمہ شمسن النساء اور اپنے بھائیوں اور بہنوں کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں جو ہزار میلوں دور رہ کر بھی میری ہر طرح سے حوصلہ افزائی کرتے رہے اور جن کے بغیر میری تعلیمی زندگی کا کوئی تصور ممکن نہ تھا۔میری تعلیم و تربیت ان ہی کی قربانیوں کی رہین منت ہے۔اللہ ان کی محبتوں اور شفقتوں کا سایہ میرے سر پر تادیر قائم رکھے۔اپنے تمام دوستوں کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں جن کی رفاقت اور محبت نے میرے لئے یہ سفر آسان کیا اور جنہوں نے اپنا قیمتی وقت دے کر مقدور بھر میری مدد فرمائی۔

فرحین کوثر
اردو زبانوں کا مرکز
جواہر لعل نہرو یونیورسٹی
نئی دہلی۔۱۱۰۰۶۷

باب اول

تقسیم ہند کی سیاست اور اس کے مضمرات

۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کی تاریخ کا سب سے اہم اور عظیم سیاسی ومعاشرتی سانحہ ۱۹۴۷ء میں بر صغیر کی تقسیم ہے۔اس المیے سے آزادی کی مسرت خاک میں مل گئی۔متحدہ ہندوستان کی صدیوں کی مشترکہ تہذیب کا شیرازہ بکھر گیا۔مذہبی رواداری اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا مروجہ نظام درہم برہم ہوکر رہ گیا۔ ہندو مسلمان انسانیت کے جامے سے باہر ہو گئے۔فرقہ وارانہ فسادات کو مزید تقویت ملی۔شرمناک اور دل سوز واقعات کی کوئی انتہا نہ رہی۔ہجرت اور تبادلۂ آبادی کے بعد دونوں ملکوں میں مہاجرین اور شرنارتھیوں کے سامنے بے شمار مسائل کھڑے ہوئے۔یہ انتہائی افسوسناک بات ہے کہ جس آزادی کی خاطر ہندو مسلمان دونوں فرقوں نے کاندھے سے کاندھا ملا کر انگریزوں کے خلاف محاذ آرائی کی تھی،غلامی کی بیڑیوں کو توڑنے کی جرأت کی تھی اور پرچم آزادی لہرانے کی غرض سے تختۂ دار کو پسند کیا تھا اس وقت کے آنے سے قبل یہ دونوں فرقے خون کے پیاسے ہو گئے۔انسان نے انسانیت،شائستگی اور تہذیب کے لبادوں کو تار تار کر کی بربریت اور بہیمت کا وہ ننگا ناچ ناچا کہ تاریخ انسانیت میں اس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔ان المناک واقعات وحادثات نے انسان کا ذہنی سکون چھین لیا۔

ملک کی تقسیم میں جن عناصر نے کام کیا ان میں برطانوی حکومت کی تباہ کن پالیسی کافی اہمیت کا حامل ہے انگریزوں کی آمد سے قبل اگر چہ ہندوستان بدنظمی کا شکار تھا لیکن برطانوی حکومت قائم ہونے سے پہلے ہندوستان میں کبھی اس طرح کے فرقہ وارانہ فسادات نہیں ہوئے جو دوران حکومت بالخصوص اس کے آخری دنوں میں واقع ہوئے۔ہندوستان میں مسلمان آئے اور بہترین حکمت عملی اور ہمدردانہ جذبہ کی تحت حکومت کی۔ہندو مسلم باہمی اتحاد و اتفاق کی فضا قائم ہونے لگی۔مغل بادشاہوں کے دربار میں انہیں لوگوں کو اعلیٰ عہدووں پر فائز کیا گیا جو ان کے اہل ہوں پھر چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان۔بالکل اسی طرح لائق مسلمانو کو ہندو ریاستوں میں جگہ دی جانے لگی۔مختلف ریاستوں کے درمیان جنگیں بھی ہوتی رہیں

جسمیں ایک ریاست کا راجا ہندو تو دوسرا مسلم ۔ باوجود اسکے کبھی بھی ہندو مسلم فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا نہیں ہوئی۔ اگر چہ انگریزوں کے آنے سے قبل بادشاہوں نے بھی مذہب کا سہارا لیا، اکبر نے دین الٰہی چلایا، اورنگ زیب و دیگر افراد نے بھی مذہب کا استعمال کیا لیکن اس کی نوعیت انگریزوں سے مختلف تھی۔ انگریزوں نے اس نفاق کو منتہائے کمال تک پہنچا دیا۔

انگریز ہندوستان میں تجارت کی غرض سے داخل ہوئے۔ سوئی قسمت اس وقت تک پورا ملک چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ سکھوں اور مراٹھوں نے اپنے اپنے علاقے میں الگ اور خود مختار حکومت قائم کر لی تھی۔ اس بد نظمی کو دیکھ کر انگریزوں کو اندازہ ہو گیا کہ یہاں فرقہ وارانہ ماحول بنانا بہت آسان ہے۔ لہٰذا انہوں نے اپنی سطحی ذہنیت اور تباہ کن پالیسی کی بنیاد پر اقتصادی، سماجی، سیاسی و معاشی طرز عمل میں پھوٹ ڈالو اور حکومت کے اصول کو نہ صرف اپنایا بلکہ اس پر عمل درآمد کرنے کی غرض سے انسانیت کو شرمسار کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔

معروف ماہر قانون کے خیال میں دنیا کے چند بڑے المناک حادثوں میں تقسیم ہند کا وقعہ بھی ایک اہم واقعہ ہے۔ جو آزادی کے ۷۰ سال گزر جانے کے بعد بھی قوم کے زخموں کو رس رہا ہے۔ اس موضوع پر مختلف زبانوں کے ادیبوں نے لاتعداد کتابیں لکھی ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ بعض اسے ضروری قرار دیتے ہیں تو کچھ غیر ضروری اور اس ضمن میں ان کی رائے بھی جدا ہے۔ بعض کی رائے میں تقسیم ہند کے خالق مسلم لیگ اور محمد علی جناح تھے اور کچھ اس کے برعکس اسکا ذمہ دار کانگریسی رہنما مثلاً نہرو اور سردار پٹیل کو مانتے ہیں۔ لیکن کلی طور پر یہ طے نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے اصل ذمہ دار کون تھے؟ کرشن مشن اور دیگر حضرات کے علاوہ دوسرے وجوہات مثلاً سماجی، تہذیبی، اقتصادی و سیاسی اور عمرانی وجوہات بھی کسی نہ کسی حد تک اس تقسیم ہند کے ذمہ دار تھے۔ ملک کی تقسیم کے پس پشت گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔

پروفیسر محمد حسن ایک مضمون میں تقسیم ہند کے دیگر وجوہات کے علاوہ دو اور عوامل کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ جن واقعات و حادثات نے ہندوستان کو سیاسی و اقتصادی آزادی دینے کی غرض سے انگریزی حکومت کو آمادہ کیا ان میں آزاد ہند فوج کا قیام اور بحریے کی بغاوت سے برطانوی حکومت میں بے چینی و

انتشار ہے جس سے اس حکومت کو ہندوستان پر اپنا تصرف کمزور ہوتا نظر آنے لگا۔

برصغیر میں حکومت برطانیہ کا قیام عہد جدید کی تاریخ کا نہایت ہی دردناک سانحہ ہے۔ یہ ہماری اس شکست کی سچی کہانی ہے جس میں خوش حال ملک کو سات سمندر پار کر کے آئے ہوئے مٹھی بھر تاجروں اور بدنیت سیاست دانوں نے شکست دے کر اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔ انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستانیوں کی یہ ہار یقیناً ایک شرمناک واقعہ تھی۔ اس واقعہ کے پس پردہ ہندوستانیوں کے اندرونی انتشار و خلفشار اور ہندوستان کی طوائف الملوکی کے جو بھی واقعات رہے ہوں بہرحال ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط برقرار رہنا ہندوستانیوں کے لئے نہایت ہی بے غیرتی کی بات تھی۔ چنانچہ ہندوستانیوں کے دلوں میں ملک کو ان جابر حکمرانوں سے نجات دلانے کا جذبہ بیدار ہوا اور انہوں نے انگریزوں سے اپنے وطن کو آزاد کرانے کی تحریک چلائی جسے تحریک آزادئ ہند کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے جسکی تاریخی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔

تحریک آزادئ ہند کا آغاز ۱۸۵۷ء کی جنگ سے ہوا۔ اگرچہ اس سے قبل بھی آزادی کی کوششوں کا میلان دیکھنے کو ملتا ہے۔ مثلاً ۱۷۵۷ء میں سراج الدولہ کی کوشش ۱۷۸۹ء میں ٹیپو سلطان کی انگریزوں سے جنگ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ کوشش ملکی سطح پر نہیں تھیں۔ لہٰذا ۱۸۵۷ء کی جنگ تحریک آزادی کی پہلی سب سے بڑی کاوش ہے۔ بقول پی سی جوشی:

> ''۱۸۵۷ء کی شورش ہندوستان میں برطانوی حکومت کے لئے وسیع پیمانے پر پہلی بڑی اور براہ راست چنوتی کی حیثیت سے ہمیشہ تاریخ میں یادگار رہے گی۔ نصف صدی کے بعد شروع ہونے والی تحریک آزادی کی تحریک کو اس سے روشنی ملی۔''(۱)

۱۸۵۷ء کی جنگ کے مختلف و متعدد اسباب و محرکات تھے۔ جس میں اول الذکر انگریزوں کے ذریعہ ہندو اور مسلم اتحاد و اتفاق میں نفاق پیدا کرنے کی کوشش تھی جو بعد ازاں بنیادی محرک ثابت ہوا۔ ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط مضبوط تر ہوتا گیا۔ اسی کی بنیاد پر فرقہ وارانہ فسادات اور ہجرت کے غیر معمولی اور اندوہناک واقعات نے ہندوستان کی نیو کمزور کر دی۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں ہندو اور مسلمان دونوں فرقوں نے متحد ہو کر مظاہرہ کیا جس سے غیر ملکی حکمراں پریشان ہو گئے۔ انہوں نے اس اتحاد کو توڑنے کی ہر ممکن کوششیں شروع کر دی۔ اس حصول مقصد کے لئے انہوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ بغاوت کے فوراً بعد

مسلمانوں پر خوف و ہراس کا ماحول قائم کرنے کے لئے ان پر ظلم و ستم ڈھانے لگے اور وسیع پیمانے پر ان کی جائداد پر قبضہ بھی کرلیا۔ انگریزوں کے اس عمل سے مسلمانوں میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے جدید ترقی کے دھارے سے کنارہ کشی اختیار کر کے روایتی اور مذہبی تعلیم کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ مسلمانوں کے برعکس ہندوؤں کو ترقی کے موقع زیادہ حاصل ہوئے جو برطانوی حکومت کی سازش کا نتیجہ تھی۔ مسلمان کا اعلیٰ طبقہ جسمیں نواب اور زمیندار شامل تھے ہندو تاجر اور سرمایہ دار کی ترقی دیکھ کر خوش نہیں ہوئے۔ کیونکہ انکو ہی احساس دلایا گیا کہ یہ ہندو کی ترقی ہے۔ مسلمانوں میں یہیں سے احساس کمتری بڑھنے لگی۔ اس طرح ہندو تاجر، سرمایہ دار اور مسلم نواب زمیندار میں نفاق پیدا ہو گیا۔۔ انتظامیہ میں چونکہ تعلیمی قابلیت کی بناء پر نوکری دی جاتی تھی اور مسلمان تعلیمی میدان میں بہت پیچھے تھے لہٰذا وہ انتظامیہ میں بھی نہ آ سکے۔ ان کے مقابلے میں ہندو کے اعلیٰ اور متوسط طبقہ کے لوگوں نے بڑی تعداد میں نوکری حاصل کر لی۔ جس نے مسلمانوں کو مزید ان کے خلاف کر دیا۔ دوسری طرف محض اس بنیاد پر کہ انہوں نے بندوقوں میں سوئر اور گائے کی چربیوں سے بنی کارتوسوں جسے چلانے سے قبل دانتوں سے کھولنا پڑتا تھا، استعمال کرنے سے منع کرنے کے جرم میں جہاں پچاس ہندوستانی سپاہیوں کو ایک فوجی عدالت کے فیصلے کے مطابق دس سال کی قید با مشقت کی سزا سنائی گئی تھی وہیں اس متنازعہ واقعہ نے ہندو و مسلم کے درمیان کشیدگی کو مزید ہوا دے دی۔ دونوں فرقوں کے سپاہیوں میں کھلبلی مچ گئی۔ چنانچہ بہادر شاہ ظفر کی سربراہی میں دارالخلافہ دہلی سے تحریک کا آغاز ہوا۔ بدقسمتی سے یہ تحریک ناکام ثابت ہوئی مگر اس کے اثرات آئندہ کی تحریک میں بھی ملتے ہیں۔ ملک کو آزاد کرانے کی جس خواہش نے ہندوستانیوں کے دلوں میں جنم لیا وہ غیر محسوس طور پر پرورش پاتی رہی جو آگے چل کر تحریک آزادی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں نے اپنے مفاد کی خاطر کچھ ایسے کام کئے جس سے ہندوستان میں قومی تحریک کا فروغ ہوا۔ جیسے جدید تعلیم، ریل ڈاک تار کا انتظام، صنعتوں کا عروج وغیرہ۔ انگریزوں نے ہندوستان کو خود کے فائدہ کے لئے فتح کیا تھا اور اسی حصول کے لئے ہندوستان پر حکومت کرتے رہے۔ جدید تعلیم یافتہ ہندوستانیوں نے ملک کی بدحالی کے اسباب کو سمجھ لیا تھا۔ اس واقعہ سے ہندوستانی تعلیم یافتہ طبقہ کو کافی ٹھیس پہنچی۔ یہ طبقہ مراعات حاصل کرنے کے لئے جدوجہد آزادی میں شامل

گیا۔انگریزوں نے رفتہ رفتہ پورے ملک کو یکساں نظم ونسق کے تحت لاکر ایک متحدہ انتظامیہ قائم کر دیا تھا۔ملکی سطح پر جدید تجارت وصنعت کے قیام میں ہندوستانی معاشی زندگی کو ایک کر دیا تھا۔اگر ملک کے کسی ایک حصے میں سیلاب یا قحط پڑتا تو ملک کے دوسرے حصے بھی اس سے متاثر ہوتے۔بمبئی اور کلکتہ کے لاکھوں مزدوروں اور سرمایہ داروں کی زندگی بھی دیہات میں رہنے والے کسانوں سے وابستہ ہوگئی تھی۔ریل ڈاک تار کے انتظام نے پورے ملک کو متحد کر دیا تھا۔اس وجہ سے سبھی ممالک میں قومی تحریک بہ آسانی مقبول ہوگئی۔

تحریک آزادی کا باقاعدہ آغاز انڈین نیشنل کانگریس کے قیام سے ہوا جو ۱۸۸۵ء میں عمل میں آیا۔ سیاسی کارکنوں، وطن پرستوں اور عوام کے مطالبوں کو حکومت کے سامنے رکھنے کے ساتھ ہی ہندوستانیوں میں قومی جذبات کی نشوونما کی غرض سے ایک سابق آئی. سی. ایس، اے. او. ہیوم نے کانگریس کی بنیاد ڈالی تھی۔اس کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے تاراچند لکھتے ہیں کہ :

> ''۱۸۵۷ء میں انڈین نیشنل کانگریس اس غرض سے قائم ہوئے کہ ہندوستان کی رائے عامہ کو منظّم کرنے اور شکایات کو دور کرنے کے لئے حکومت پر زور ڈالے۔''(۲)

کانگریس کے قیام کے ابتدائی زمانے میں حکومت نے اپنا معاون اور وسیلۂ تحفظ سمجھ کر اس کی مدد کی۔لیکن جب کانگریس نے قانونی اصلاح کا مطالبہ کیا تو حکومت اس کی جانب سے بدظن ہونے لگی۔۲۸ دسمبر ۱۸۸۹ء کو انڈین نیشنل کانگریس کا پہلا اجلاس بمبئی میں ڈبلو. سی. بنرجی کی صدارت میں ہوا۔اجلاس میں کانگریس نے مختلف النوع معاملات پر توجہ مرکوز کی۔

(۱) مرکزی اور صوبائی مجالس قانون ساز ممبران کی تعداد اور ان کے حدود عمل کی میں توسیع۔

(۲) ہندوستانیوں کو ع اونچی ملازمت میں زیادہ سے زیادہ موقع فراہم کرنا۔

(۳) ہندوستان میں غریبی اور بے روزگاری پر خاص توجہ دینا۔

لارڈ کرزن دسمبر ۱۸۸۹ء کو ہندوستان کا وائسرائے بنا اور اپنے اقتدار کو مزید تقویت دینے نیز ہندوستان پر نئے قوانین مسلط کرنے کی طرف مصروف ومستغرق ہوگیا۔چنانچہ اس نے کانگریس کے سیاسی پروگرام کو نظرانداز کرنا شروع کر دیا۔کانگریس کی بیخ کنی کا جذبہ کرزن کے اندر کس حد تھا درج ذیل

عبارت سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ڈاکٹر تاراچند اس حوالے سے رقمطراز ہیں:

''میرا اپنا یقین یہ ہے کہ کانگریس اس طرح ٹوٹ رہی ہے کہ فنا ہونے والی ہے اور میرے منصوبوں میں ایک منصوبہ یہ بھی ہے کہ میں اسے امن وامان کے ساتھ دفن ہو جانے میں مدد کروں گا۔''(۳)

اس اقتباس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ لارڈ کرزن کا مقصد ہر دوصورتوں میں ہندوستان میں برطانوی حکومت کو مسلط کرنا تھا۔جس کے لئے اس نے کانگریس کو ختم کرنے کی طرف اپنی منصوبہ بندی شروع کر دی۔کانگریس کی بیخ کنی کا جذبہ کرزن کے اندر سانسیں لینے لگی۔اس نے ہندوستانی عوام پر شکنجہ کسنے کی خاطر ان پر مراعات کی بارشیں لٹانی شروع کر دی تا کہ وہ برطانوی حکومت کے مقاصد سے بے خبر ان سہولیات کی طرف ان کی توجہ مبذول ہو جائے۔حکومت کے اس سخت رویہ سے کانگریس میں مزید جوش وخروش کا جذبہ بیدار کر دیا اور جس میں کامل آزادی اسے اپنا منزل مقصود بنایا۔کانگریس کے پہلے صدر ڈبلو۔ بنرجی اس کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار ذیل الفاظ میں کیا ہے:

''غالباً یہ بات بہت سے لوگوں کو نہیں معلوم کہ انڈین نیشنل کانگریس جس طرح قائم ہوئی اور جس طرح اس کے بعد سے کام کر رہی ہے اصل میں یہ مارکولس آف ڈفرن کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ یہ اس وقت کا کارنامہ ہے جب یہ شریف ہندوستان کا گورنر جنرل تھا۔مسٹر اے او ہیوم نے ۱۸۸۴ء میں سوچا کہ ملک کو اس سے بڑا فائدہ پہنچے گا اگر ملک کے بڑے بڑے سیاست داں سال میں ایک مرتبہ ایک جگہ اکٹھا ہوں اور سب مل کر سماجی مسائل پر غور کریں۔حکومت یہ بتائیں کہ نظم ونسق میں خرابیاں ہیں اور اسے کس طرح بہتر بنایا جا سکتا ہے۔''(۴)

ہندوستان میں قومی تحریک کو فروغ دینے میں بین الاقوامی اثرات نے نمایا کردار ادا کیا ہے۔۱۹۰۴ء میں روس جاپان کی جنگ ہوئی جس میں روس کو شکست کا سامنہ کرنا پڑا۔۱۸۹۴ء میں حبشہ نے اٹلی کو شکست دی جس سے متاثر ہو کر کراچی کے اخبار 'کرانیکل' نے لکھا کہ:

''ایک ایشیائی ملک نے جو کچھ کیا ہے وہی ایشیا کی دوسری قومیں بھی کر سکتی ہیں .....اگر جاپان روس کو شکست دے سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہندوستان انگلستان کو شکست نہ دے سکے..... آؤ ہم سب مل کر انگریزوں کو سمندر میں ڈھکیل دیں اور جاپان کے ساتھ ہم بھی

دنیا کے عظیم طاقتوں کی محفل میں اپنی جگہ لیں۔''(۵)

انڈین نیشنل کانگریس کی تشکیل کل ہند سطح پر قومی تحریک شروع کرنے کی طرف پہلی کاوش تھی جس میں متعدد شعبۂ جات کے افراد مثلاً وکیل وتاجر، صنعت کار، صحافی، اساتذہ اور زمیندار وغیرہ شامل ہوئے اور اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس کے علاوہ ہندوستان کا نوجوان طبقہ بیداری کی تحریک کی چرف متوجہ ہوگئے۔ اس طرح انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستان کی قومی تحریک کا ابتداء ہونے کے لئے ماحول بن چکے تھے۔ عوام میں جوش و بیداری پیدا ہو چکی تھی جو اس سے قبل ناپید تھی۔ انگریزوں کا ترقی پسند دور ختم ہو رہا تھا اور ہندوستانی سماج میں نئی قوتیں سر ابھار رہی تھیں۔ ہندوستان اپنی سیاسی جہد وعمل میں تیز رفتاری کے ساتھ رخت سفر تھا۔ چنانچہ بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی ہندوستان میں قومی تحریک نے زور پکڑنا شروع کر دیا۔ اس تحریک میں چونکہ ہندو مسلمد ونوں مذاہب کے لوگ شامل تھے لہٰذا لارڈ کرزن نے 'پھوٹ ڈالو اور راج کرو' کی منصوبہ بندی کے تحت ۱۹۰۳ء میں تقسیم بنگال کا نیا شوشا چھوڑ دیا۔ کرزن کا خیال تھا کہ بنگال کے مشرقی علاقہ میں مسلمانوں کی اکثریت موجود ہے۔ مشرقی بنگال اور مغربی بنگال بن جانے سے وہاں کے مسلمان انتظامیہ میں زیادہ حصہ پانے کا مطالبہ کریں گے، جس کی وجہ سے ہندو مسلم سیاسی کشمکش ہو جائے گی اور پورے بنگال میں حکومت کے خلاف بڑے پیمانے پر چل رہی تحریک کمزور پڑ جائے گی۔ لیکن یہ محض کرزن کی خام خیالی ثابت ہوئی اس تجویز کے متعلق جیسے ہی ہندو مسلم بنگالیوں کو پتہ چلا انہوں نے باہمی اتحاد واتفاق سے اس کی مخالفت شروع کر دی۔ کرزن نے اس کی حمایت میں مسلمانوں کو راضی کرنے کی غرض سے مشرقی بنگال کا دورہ بھی کیا اور ذہنی طور پر تیار کرنے کے لئے مذہبی عوامی جلسہ کر کے انہیں سمجھانے کی نت نئی کوششیں کی:

> ''مشرقی بنگال کو ایک الگ صوبہ بنانے کا خاص مقصد یہ ہے کہ وہ ایک مسلم صوبہ ہو جس پر اسلام اور اس کے پیروؤں کا غلبہ ہو..... تقسیم بنگال کی بدولت مشرقی بنگال کے مسلمانوں میں وہ اتحاد پیدہ ہو جائے گا جو انہیں پرانے زمانے کے مسلمان صوبہ داروں اور بادشاہوں کے بعد آج تک نصیب نہیں ہوا۔''(۶)

اس عمل سے کرزن کو خاطر خواہ کامیابی ملی۔ مسلمانوں میں ایک اندھا جوش پیدا ہو گیا کہ حکومت ان

کے ہاتھوں میں آ گئی ہے۔اس اندھی تقلید اور خوش فہمی نے زمیندار سرمایہ دار کے خلاف جس میں کثیر تعداد ہندوؤں کی تھی سوزش کی شکل اختیار کر لی۔نتیجتاً پورے صوبے میں فرقہوارانہ فسادات شروع ہو گیا۔کرزن کا خدشہ کہ ہندو مسلم قومی اتحاد سے کہیں حکومت کمزور نہ پڑنے لگے جلد از جلد ختم ہو گیا۔۱۹۰۵ء میں لارڈ کرزن نے قانون ساز کونسل میں تقسیم بنگال کی تجویز منظور کروالی۔تقسیم بنگال کرزن کی سیاسی وسیع النظری کی رہین منت ہے۔لارڈ کرزن کے علاوہ ایم۔او کالج کے پرنسپل مسٹر بیگ نے ہندوستان کے مختلف فرقوں میں نفاق کی فضا کو مزید ہوا دینی شروع کر دی۔انہوں نے مسلم طبقہ کی نمائندگی کرتے ہوئے ایک مراسلہ تیا کیا جس میں برطانوی پارلیمنٹ سے یہ گزارش کی گئی کہ ہندوستان میں ہندو مسلم دو مذہب نہین بلکہ دو قومیں آباد ہیں۔مسٹر بیگ نے اینگلو اورینٹل ڈیفنس ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی اور اس کے سکریٹری کے عہدہ کو سنبھالا۔اس ایسوسی ایشن کے اغراض و مقاصد میں انگریزی حکومت کے قیام اور بقا کو تقیت پہنچانا ،مسلمانوں میں سیاسی انتشار کو روکنا نیز ان کے سیاسی حقوق کی حفاظت کرنا وغیرہ شامل تھا۔پرنسپل مسٹر بیگ نے انگریزوں پر اس بات کے لئے زور ڈالا کہ ہندوستان میں سیاسی مظاہروں پر حد بندی لگانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اس ضمن میں مسلمانوں کا تعاون حاصل کریں۔ایم۔او۔کالج کے دوسرے پرنسپل نے مسلمانوں کے نمائندوں کو اس بات پر اکسایا کہ وہ وائسرائے لارڈ منٹو سے ایک ڈپوٹیشن کی صورت میں ملیں اور ان کی خدمت میں ایک مراسلہ پیش کریں۔ان کا مشورہ تھا کہ ابتدا میں وفاداری کا اظہار کیا جاے، ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کے سلسلے میں ان کی کوششوں کا شکریہ ادا کیا جائے۔ساتھ ہی یہ بھی گزارش کی جائے کہ ہندوستان میں انتخاب کا اصول رائج کرنے کی صورت میں ہمیں نقصان پہنچے گا لہٰذا مذہب کی بنیاد پر جداگانہ انتخاب کا اصول رائج کیا جائے گا۔المختصر پرنسپل نے زور دے کر کہا کہ مسلمانوں کا ایک علیحدہ حلقۂ انتخاب مذہب کی بنیاد پر ہونا چاہیئے۔مسلم لیگ کے قیام میں مسٹر جناح کو پرنسپل کی پشت پناہی حاصل تھی۔

۱۹۰۵ء میں روس میں انقلاب کے بعد ایک نئی جدو جہد کے لئے ماحول سازگار ہوئے تو معشی عدم تعاون نامی جیسے جدید قسم کے معاشی ہتھیار کا استعمال کیا گیا۔اس کی حمایت اعتدال پسند لیڈران سرفہرست تھے۔یہ ایک درمیانی طبقے کی تحریک تھی۔تقسیم بنگال اور غیر ملکی سامان کا بائیکاٹ ۱۹۰۵ء میں کیا گیا۔وہیں بغاوتی جلسوں کے خلاف ۱۹۰۷ء میں قانون پاس کیا گیا اور ۱۹۱۰ء میں اخباراں پر سخت پابندی آئد کر دی گئی۔اس

دوران بال گنگا دھر تلک کی گرفتاری سیاسی جدوجہد کا سب سے اہم ترین واقعہ تھی۔ بقول ابوالکلام آزاد:

> ''حکومت تلک سے سب سے زیادہ ڈرتی تھی انھیں ۱۹۰۸ء میں اپنے اخبار کے ایک مضمون شائع کرنے کے جرم میں چھ سال کی قید کی سزا دی۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم شروع ہونے کے ایک ماہ پہلے تک انہیں ''مانڈے'' برما کی جیل خانے میں قید رکھا۔ تلک کی گرفتاری میں بمبئی سوتی کار خانوں کے مزدوروں نے عام ہڑتال کر دی۔ لینن نے اس زمانے کو خوش آمدید کہا تھا اور یہ بتایا تھا کہ یہ ہڑتال اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ مستقبل کی تاریخ میں مزدور طبقے کا کتنا بڑا ہاتھ ہے۔''(۷)

تقسیم بنگال کی مخالفت ایک قومی تحریک کی صورت میں شروع ہوئی۔ جس نے فرقہ وارانہ فسادات کو جنم دیا۔ کچھ قدیم قوم پرست لیڈروں کو برطانوی سامراج سے جو امیدیں تھیں وہ تقریباً ختم ہوگئی اور ان کو شکست کا سامنا کرنا پڑا تو کانگریس دو گروہ میں تقسیم ہو گیا۔ پہلا گروہ اعتدال پسندوں کا اور دوسرا انتہا پسند۔ سودیشی تحریک اور بائیکاٹ کا تعلق تقسیم بنگال کی مخالفت سے ہے۔ اس مخالفت نے اعتدال پسندوں اور انتہا پسندوں کے درمیان پیدہ شدہ خلیج کو مزید وسعت دے دی۔ چنانچہ ۱۹۰۷ء کی صورت کانفرنس میں کانگریس باضابطہ طور پر منقسم ہوگئی۔ اعتدا پسندوں میں دادا بھائی نوروجی، سریندر ناتھ اور گوپال کرشن گوکھلے کے نام اہم ہیں۔ جبکہ انتہا پسندوں کی فہرست میں لالہ لاجپت رائے، بپن چندر پال اور تلک کے نام شامل ہیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ کانگریس کی تقسیم کے بعد بھی اس پر اعتدال پسندوں کو فوقیت حاصل تھی۔ توسیم بنگا لکے خلاف ایجیٹیشن کی کامیابی کو دیکھتے ہوئے ۱۹۱۱ء میں حکومت نے تقسیم کو ختم کرنے کا اعلان کیا۔ اس کے بعد بھی اعتدال پسندوں کے درمیان نظریاتی تصادم برقرار رہا۔ حکومت نے اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اعتدال پسندوں کو اپنا پاسدار بنانے میں کامیاب حاصل کر لی۔ اس عمل سے انتہا پسندوں کو اس کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے کا بہتری موقع فراہم ہوئے اور انہوں نے اعتدال پسندوں کے رویوں کو عوام کے سامنے پیش کر کے اپنی ساخت قائم کر لی۔ ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ آزادی کی شروعات ہونے سے قومی تحریک کمزور ہونے لگی لیکن اس میں تلک کا بہ بانگ دہل کیا گیا اعلان بھی یاد کر لینا چاہیئے کہ'' آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے'' اس عہد کی قومی تحریک کی قدر و قیمت متعین کرتے ہوئے تاراچند فرماتے ہیں کہ:

''۱۹۱۴ء میں قومی تحریک کا جوار بھاٹا بہت نیچے اتر گیا تھا۔اب پبلک معتدل سیاسی رہنماؤں پر سے اپنا اعتماد کھو چکی تھی اور انتہا پسند لیڈران چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے۔کچھ تو تلک کی طرح جیل میں سڑ رہے تھے اور چند دوسرے لوگ مثل پین چندر پال اور لاجپت رائے خود خواستہ جلاوطنی اختیار کئے ہوئے تھے اور اپنے انگلستان اور امریکہ کے اندر کے دور دراز کے مرکزوں سے لڑائی جاری رکھے ہوئے تھے۔انتہا پسندوں کا کام بیکار نہیں گیا تھا۔''(۸)

کانگریس چونکہ کمزور جماعت بن چکی تھی اس لئے ایسے نازک موقع پر مسز اینی بیسنٹ نے ہوم رول کی تحری کا آغاز کر کے اسے فعال بنانے کی کوشش کی۔اس لیگ کا مقصد ہندوستانیوں کو نوآبادیاتی طرز کی حکومت دینی تھی۔اینی بیسنٹ نے کانگریس کو از سر نو متحد کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنے کے علاوہ کانگریس اور مسلم کے درمیان صلح کروائی۔۱۹۱۶ء کی لکھنؤ کانفرنس میں کانگریس کے دونوں گروہوں کو ایک پلیٹ فارم پر لا کر انہوں نے اپنی بے لوث خدمت کا ثبوت پیش کی۔

وائسرائے کے سایہء عاطفت میں دسمبر ۱۹۰۶ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔اسکی تشکیل کی محرک تقسیم بنگال کے خلاف وہ شورش تھی جس کی بنیاد ہندوؤ کے مذہبی مراسم پر تھی۔اس نے مسلمانوں میں انتشار پیدا کیا، برطانوی سرکار جو پہلے مسلمانوں کو سیاست سے الگ رکھنے میں مصلحت سمجھ رہی تھی اب اس شورش کو کم کرنے اور انہیں کانگریس کے مقابلے میں لانے کی غرض سے دوبارہ مسلمانوں کی حمایت کا منصوبہ بنانے لگے۔جس سے شملہ وفد کی تشکیل عمل میں آئی۔انگریزی حکومت کو یہ امید تھی کہ فرقہ پرستی کی بنیاد پر ووٹوں کے بٹوارے کے ساتھ ساتھ اگر مسلمانوں کی سیاسی پارٹی قائم ہو جائے تو قومی تحریک اور کانگریس کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکا جا سکتا ہے۔شملہ سے وفد کی واپسی کے بعد محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس منعقد کی گئی جس میں مسلمانوں کی ایک مخصوص سیاسی جماعت کی تشکیل کی تجویز رکھی گئی۔آگے چل کر اس تجویز کے مطابق وقار الملک کی صدارت میں مسلم لیگ کی بنیاد پڑی۔اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ کانگریس مسلم لیگ اور ہوم رول لیگ کے مشترکہ کاوشوں سے قومی تحریک کو بڑی تقویت حاصل ہوئی۔بالآخر انگریزی حکومت کو ۱۹۱۷ء میں سلف گورنمنٹ کی طرف رجوع کرنا پڑا۔

۱۹۱۸ء کے اواخر اور ۱۹۱۹ء کے اوائل میں بمبئی کے سوتی کارخانوں کے مزدوروں نے ہڑتال شروع

کر دی،اس وقعہ سے ہندوستان میں شدید بے چینی پیدا ہوگئی۔اس ہڑتال کو روکنے کے لئے پھر سے نیا قانون نافذ کیا گیا جس کے وجہ سے حکومت پہلے سے کہیں زیادہ بااختیار ہوگئی۔عدالتی کاروائیوں کے بجائے براہ راست سزائیں دی جانے لگی۔اس نئے قانوں سے ہندوستانی عوام میں غصے کی لہر دوڑ گئی اب وہ برطانوی سامراج کی پالیسی اوراس کے پس پشت ان کے مقاصد کو سمجھنے لگے۔گاندھی جی کے سیاسی میدان میں آنے کا یہی زمانہ تھا۔۱۸۹۸ء اور ۱۹۱۶ء کے درمیان جنوبی افریقہ میں قیامکے دوران سے ہی ان کے دل میں ہندوستانیوں کے متعلق ہمدردی کا جذبہ بیدار ہونے لگا تھا۔ ہندوستانیوں کی ذلت اور خواری کو مٹانے کی غرض سے انہوں نے افریقہ میں قومی وقار اور انسانی حقوق کی حمایت میں ایک تحریک چلائی تھی۔گاندھی جی نے جنوبی افریقہ کے تجربے سے فائدہ اٹھا کر ''رولٹ ایکٹ'' کے خلاف فروری ۱۹۲۰ء میں ستیہ گرہ لیگ قائم کی جس کے نتیجے میں عام ہڑتال کی گئی۔اس میں عوام نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جس سے پورے ملک میں مظاہروں و ہڑتالوں کا آغاز ہوگیا۔حکومت نے ان مظاہرین پر سخت تشدد سے کام لیا۔بعض مقامات پر تصادم اور فسادات کے واقعات بھی رونما ہوئے جس میں کثیر تعداد میں لوگ جاں بحق اور زخمی بھی ہوئے ۔باوجود اس کے ہڑتالیوں نے نہایت جرأت مندی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا اور بے نظیر اتحاد کا عملی ثبوت پیش کیا۔ڈاکٹر ظفر سعید نے اس اتحاد کی مکمل تفسیر بیان کی ہے:

> ''عام ہیجان کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں بے نظیر اتحاد اور بھائی چارہ پیدا ہوگیا۔قومی تحری کا ایک عرصے سے نصب العین یہ بن گیا تھا کہ ہندو اور مسلم دونوں میں اتحاد پیدا کیا جائے اس دور میں نچلے طبقوں نے بھی ایک مرتبہ اپنے تمام اختلاف بھلا دیے جس سے بھائی چارے اور اخوت کے غیر معمولی منظر سامنے آنے لگے۔ ہندو اور مسلمان علی الاعلان ایک دوسرے کے ہاتھ کا پانی پینے لگے۔ ہر جلوس کا سب سے بڑا نعرہ ہندو مسلم اتحاد تھا۔ یہ نعرہ تمام جلوس لگاتے تھے اور یہ ہی ان کے جھنڈوں پر لکا رہتا تھا۔ ہندو لیڈروں کو مسجد کے منبروں پر سے تقریر کرنے کی اجازت دی جانے لگی۔''(۹)

۱۹۱۸ء میں کانگریس نے مانٹیگو چیمسفورڈ ریفارم کے مسئلے پر اختلاف ہوگیا۔اس ریفارم کا لب لباب یہ تھا کہ ایک ایسی گورنمنٹ قائم ہو جس کی باگ ڈور تو برطانوی طاقت کے ہاتھوں میں رہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ہندوستانیوں کے سامنے بھی ذمہ دار ہو۔اعتدال پسندوں نے مذکورہ ریفارم کی تائید کی۔

جب کہ اس کے برعکس انتہا پسندوں نے اس کی سخت مذمت کی۔ بالآخر معتدلین نے کانگریس سے الگ ہوکر سریندر ناتھ بنرجی کی قیادت میں ایک نئی تنظیم ''انڈین لبرل فیڈریشن'' کی تشکیل کی۔

۱۹۱۸ء ہی میں حکومت نے سر سڈنی رولٹ کی سرکردگی میں ایک کمیٹی بنائی جس کی غرض وغایت مجومدار کے لفظوں میں یوں تھی:

> "To investigate and report on the nature and extent of the criminal conspiracies connect with the revolutionary movement, to examine and consider the difficulties that have arisen in dealing with such conspiracies and to advise government to deal affectively with them."(10)

جب ۱۹۱۹ء میں یہ ایکٹ باضابطہ طور پر نافذ ہوا تو اس کے خلافت میں گاندھی جی نے عدم تعاون کی تحریک کی شروعات کی۔ قبل ازیں ۱۹۱۸ء کی دہلی کانفرنس میں کانگریس نے اس ایکٹ کے خلاف نبرد آزما ہونے کا عزم کیا تھا۔ اس احتجاج وانحراف کی وجہ پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر تاراچندیوں رقمطراز ہیں:

> ''اس رپورٹ کی بنیاد پر حکومت ہند نے مجلس قانون ساز کے لئے وہ مسودہ قانون طیار کئے جس کا مقصد عام کاروائی کے ذریعے جرم میں ملوث اشخاص کے زیادہ سے زیادہ مقدموں کا فیصلہ کرنا اور تیزی کے ساتھ سزا دینا تھا۔ اس مقصد کے لئے خصوصی عدالت، جس کے فیصلہ کی کوئی اپیل نہیں ہوسکتی تھی، خفیہ مقدمہ چلانے اور ایسی گواہی کی سماعت جو قانونی شہادت کی رو سے قابل سماعت نہ ہو، اہتمام اسی مقصد کے لئے کیا گیا۔ صوبائی سرکاروں کو تلاشی لینے، گرفتا کرنے اور ضمانت طلب کرنے وغیرہ کے غیر معمولی اختیارات دئے گئے۔''(۱۱)

رولٹ ایکٹ کے ان نکات نے ہندوستانی عوام میں غصہ کی لہر کو مزید تیز کر دیا۔ ۱۳/اپریل ۱۹۱۹ء کا جلیاں والا باغ جیسا دلسوز واقعہ رولٹ ایکٹ کا ہی نتیجہ تھا۔ صوبہء پنجاب میں شورش زور پکڑنے لگی۔ جنرل ڈائر نے پنجاب کے کانگریسی لیڈر ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ستیہ پال کو شہر بدر کر دیا۔ اس سے عوام میں بے چینی پیدا ہوگئی۔ نتیجتاً امرتسر کے جلیاں والا باغ کے ایک جلسے کا انعقاد ہوا۔ یہ باغ عمارتوں سے محصور ایک خلا ہوا احاطہ تھا۔ اس میں تقریباً پچاس ہزار لوگوں کی جم غفیر تھی جو پرامن طریقہ سے اپنے رہنماؤں کی تقریریں

سن رہے تھے۔جنرل ڈائر نے بغیر کسی اطلاع کے فوجیوں کو وہاں موجود نہتے اور بے قصور لوگوں پر گولیاں چلانے کا پروانہ جاری کر دیا۔اس خونی کھیل میں سینکڑوں معصوم و بے گناہ لوگوں کو اپنی جان گنوانی پڑی۔ برطانوی حکمرانوں نے جنرل ڈائر کی نہ صرف تعریف کی بلکہ اسے انعام واکرام سے بھی نوازا۔ڈائر کے اس بدترین عمل سے پورے ملک میں خوف ودہشت کا ماحول بن گیا۔تمام ہندوستانی خود کو غیر محفوظ سمجھنے لگے۔مہاتما گاندھی بھی بہت پریشان ہو گئے۔انہوں نے عوام کو خبردار کر دیا اور مکمل انہماک و سپردگی کے ساتھ قومی تحریک میں شریک ہونے کو فرض اولین بتایا۔

۱۹۱۹ء کا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی تحریک آزادی کے سلسلے میں خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ڈاکٹر تاراچند نے اس ایکٹ کا تجزیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ :

> ''گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء کے واقعات کا نچوڑ یہ تھا کہ سوائے ایمرجنسی کے واقعات کے جس کا اعلان کرنے کا مجاز گورنر تھا،قانون ساز اسمبلیوں کو بہت سے صوبائی موضوعات پر کنٹرول دے دیا گیا تھا اور ان قانون ساز اسمبلیوں میں عوام کے منتخب شدہ ممبران کی اکثریت تھی۔''(۱۲)

۱۹۲۰ء کو لالہ لاجپت رائے کی صدارت میں کلکتہ میں کانگریسی خصوصی اجلاس منعقد ہوا۔اس اجلاس میں کانگریس نے ''سوراج'' کو اپنا منزل مقصود قرار دیا نیز ''دستوری طریقوں'' کے بجائے جائز و پرامن ذرائع اپنانے پر زور دیا گیا۔اسی طرح بائیں بازو کی قوتیں مسلم لیگ میں بھی اپنا اثر دکھانے لگیں۔لہٰذا ۱۹۲۱ء احمد آباد میں کانگریسی لیڈران کے علاوہ جب گاندھی جی بھی شامل تھے،مولانا حسرت موہانی نے اپنے خطبہ صدارت میں ''جمہوریہ ہند'' اور ''آزادی کامل'' کے مطالبات سے اعتدال پسند قیادت کو چونکا دیا اور جب ان کی اس تجویز سے مسلم لیگ نے اتفاق نہیں کیا تو مولانا حسرت موہانی نے کانگریس کے اجلاس میں اسے پیش کرنے کی کوشش کی لیکن گاندھی جی کی مخالفت نے اسے وہاں بھی مسترد کر دیا۔

تحریک خلافت نے قومی تحریک کو خاصی تقویت فراہم کی۔خلافت تحریک کا پس منظر مختصراً یوں ہے کہ ترکی کا خلیفہ عالم اسلام کا مذہبی پیشوا مانا جاتا تھا۔اس کی حکومت یوروپ،ایشیا اور افریقہ تینوں براعظم پر پھیلی ہوئی تھی۔نشأۃ ثانیہ اور صنعتی انقلاب کے بعد یوروپ نے ترکی کو معاشی وسیاسی ہر لحاظ سے اپنے

راستے کی رکاوٹ سمجھا۔ ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم ہوئی تو ترکی برطانیہ کے خلاف جرمنی کی حمایت میں جنگ میں شامل ہوا۔ ہندوستانی مسلمانوں کو خدشہ تھا کہ جنگ کے خاتمہ کے بعد برطانیہ ترکی سے ضرور بدلہ لے گا۔ جب جنگ میں جرمنی کی شکست کے بعد ترکی کی سلطنت کو انگلینڈ اور اس کے حامیوں نے آپس میں تقسیم کر لیا۔ خلیفہ کی بے حرمتی کی گئی خلافت تحریک کی غرض وغایت خلیفہ کی حقوق واختیرات کی بازیابی تھی۔ ستمبر ۱۹۱۹ء کو لکھنؤ کانفرنس میں آل انڈیا خلافت کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی۔ اس کا ایک اجلاس ۲۳ رنومبر ۱۹۱۹ء کو فضل الحق کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس میں گاندھی جی اور موتی لال نہرو کے علاوہ مدن موہن مالویہ جی بھی شریک تھے۔ مولانا عبدالباری کو اس کا معمار اول قرار دیا جاتا ہے۔ بعدازاں میں علی برادران کی مشترکہ کوششوں کو اس تحریک سے بے حد مضبوطی حاصل ہوئی۔ تاراچند نے خلافت تحریک کے سلسلہ میں یوں رقمطراز ہیں:

> ''ترک موالات کی تحریک کی کامیابی کا انحصار کانگریس اور خلافت کے باہمی اشتراک عمل پر تھا۔ ۳۰ رمئی ۱۹۲۰ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے اپنے اجلاس منعقدہ الہ آباد میں اس عمل پر بحث کی اور تب کانگریس کا ایک خاص اجلاس کلکتہ میں ستمبر کو گیا۔ لاجپت رائے نے صدارت فرمائی۔ کانگریس نے ترک موالات کی تحریک کی منظوری دے دی لیکن سوراجیہ کے مقصد خلافت کے ساتھ منسلک کر دیا۔'' (۱۳)

گاندھی جی نے یہ اعلان کر دیا کہ عدم تشدد اور عدم تعاون کی تحریک اس وقت تک جاری رہے گی جب تک سوراج حاصل نہ ہو جائے۔ اس تحریک کا اثر دیر پا رہا۔ ردعمل کے طور پر حکومت کے تمام خطابات واپس لے لئے گئے۔ اسمبلیوں، عدالتوں اور تعلیم اداروں کا بائیکاٹ شروع ہو گیا۔ ایک طرف جہاں لگان و دیگر ٹیکس سے پابندی ہٹا دی گئی وہیں غیر ملکی چیزوں کے استعمال پر پابندی لگا دی گئی اور سوت و کپڑے بننے کی گاندھی جی کی اسکیم پر عمل کیا گیا۔ اس منفرد پالیسی کی بنیاد پر کانگریس اس وقت کی سب سے بڑی و مقبول سیاسی جماعت بن گئی۔ ۱۹۲۱ء میں گاندھی جی کی قیادت میں تحریک آزادی کی مہم نے کئی منزلیں طے کیں۔ ان کے ہاتھ میں کل اختیارات آ گئے۔ لہٰذا ہر شخص کی نگاہیں انکی طرف مرکوز ہو گئی تھیں کہ اب ان کا اگلا قدم کیا ہوگا۔ سینکڑوں مجاہدین ''گاندھی جی جئے'' کے ساتھ جیل جا رہے تھے۔ اس طرح ۱۹۲۳ء کے

انتخابات میں کانگریس نے زبردست کامیابی حاصل کی اور وہ مرکز کی سب سے مضبوط پارٹی بن گئی۔اخیر میں کانگریس کے ایک اجلاس کی قیادت گاندھی جی نے کی جو اس وقت کے نہایت تجربہ کار اور سمجھدار تصور کئے جاتے تھے۔عوام میں ان کا بیحد رسوخ تھا۔بین الاقوامی اخباروں نے بھی ان کے اس ول کی خوب حوصلہ افزائی کی۔ان کی دیانتداری وانکساری کے ساتھ دی گئی عدم تشدد اور تیاگ کی دی گئی تعلیم ہی مسلسل کامیابی کا راز تھا۔۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۴ء تک مسلم اور کانگریس کے مابین خوشگوار تعلقات کی فضا قائم رہی۔۱۹۲۷ء میں کانگریس نے نہرو رپورٹ کی صورت میں حکومت برطانیہ کو ہندوستان کے مستقبل کا آئین پیش کیا تو اس میں علیحدہ انتخاب اور مرکزی اسمبلی میں مسلمان کے لئے کم وبیش ایک تہائی نشستوں کی شرائط جنھیں لکھنؤ پیکٹ ۱۹۱۶ء میں منظوری ملی تھی،اسے ختم کر دیا۔مسلم ممبران کی طرف سے مسلمانوں کے جملہ حقوق کی حفاظت نہرو رپورٹ میں متعدد تبدیلیاں لانے کی تجویز رکھی گئیں مگر وہ تمام تر تجویزیں منسوخ کر دی گئیں۔جس سے مسلم لیڈران کے دلوں میں ہندوؤں کے متعلق شبہات پیدا ہو گئے۔ چنانچہ مسلم لیگ نے مخالفت شروع کر دی۔مسلم لیگ نے نہرو رپورٹ کی حمایت کی اور سائمن کمیشن سے عدم تعاون کی بنیاد پر کانگریس کی تجویز کی مخالفت کی۔

فروری ۱۹۲۲ء میں گاندھی جی نے تحریک عدم تعاون کو مزید تقویت فراہم کرنے کے لئے سول نا فرمانی کی تحریک کا اعلان کیا۔جیسے ہی اس تحریک کی ابتداء ہوئی گورکھپور کے نزدیک چوری چورا کے مقام پر پولیس والوں کو قتل کئے جانے کی وجہ سے گاندھی جی کو تحریک ملتوی کرنی پڑی۔اس سے کانگریسیوں کے درمیان دوبارہ نظریاتی تصادم پیدا ہوگیا۔لہٰذا سی. آر. داس اور موتی لال نہرو وغیرہ کے باہمی اشتراک سے سوراجیہ پارٹی کی تشکیل ہوئی۔اس کے بعد مجلس قانون ساز کے باہر ایسے واقعات رونما ہوئے جنھوں نے سوراج پارٹی کے مستقبل کو بری طرح متاثر کیا۔۱۶/جون ۱۹۲۵ء کو ملک کی بدقسمتی سے سی. آر. داس دفعتاً وفات پا گئے۔اس مختصر عرصہ ہی میں جب سے انہوں نے سوراج پارٹی قائم کی تھی ان کی قیادت کی غیر معمولی استعداد ظاہر ہوگئی تھی۔انہوں نے نہ صرف اپنے کانگریسی ساتھیوں جن میں گاندھی جی بھی شامل تھے،کی مخالفت کے باوجود کل ہند پیمانے پر سوراج پارٹی کی تنظیم کی تھی بلکہ گاندھی جی کو بھی اپنا ہم خیال بنالیا تھا اور کانگریس کو راغب کر لیا تھا کہ وہ سوراج پارٹی کو اپنا لے۔داس کی موت سے سوراج پارٹی سخت دھچکا

پہنچا۔حکومت کے خلاف معرکہ آرائی میں جو پارٹیاں اب تک اس کے ساتھ تعاون کر رہی تھیں اب اس سے ناموافقت اوراور بے اطمینانی کا اظہار کرنے لگیں جلد ہی یہ اختلاف کھل کر سامنے آ گئے جس سے پارٹی میں آخر کار پھوٹ پڑ گئی۔حالات میں کوئی سدھار نہیں ہوا اور نہ فرقہ وارانہ فسادات میں کمی آئی۔اس وقت کا سب سے زیادہ سنگین فساد کلکتہ میں ہوا۔ یہ اپریل اور مئی ۱۹۲۶ء کے چھ ہفتوں تک رہا۔دیگر ہولناک جرائم کے ساتھ سب سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہوئی کہ متعدد مختلف مذاہب کی عبادت گاہوں کی بے حرمتی کی گئی۔وسط جون ۱۹۲۵ء میں سی. آر. داس کی وفات اور جنوری ۱۹۲۶ء میں گاندھی جی سیاست سے علیحدگی اختیا کرنے کے باعث اتحاد کی ساری طاقتیں بہت کمزور ہو گئیں۔فرقہ وارانہ جماعتیں مثلاً ہندو مہا سبھا اور مسلم لیگ فرقہ وارانہ مسائل پر لگے بندھے نظریات کا اعادہ کرتی رہیں۔ ۱۹۲۷ء کے پورے سال میں اس قدر تناؤ اور کشیدگی کیں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہوئی۔لیکن اپریل ۱۹۲۸ء سے صورت حال میں بہتری کے آثار نمودار ہونے لگے۔سیاسی حالات میں بہتری کا سبب یہ ہوا کہ برطانوی پارلیمان نے سائمن کمیشن کی بحالی کا اعلان کر دیا۔ یہ اس نظریے کا مزید ثبوت تھا کہ ہندو مسلم اختلافات سیاسی جذبات کے تھت ہوئے تھے مذہبی نہیں تھے۔مذہب صرف ظاہری کوشش تھی بنیاد نہیں تھی۔سائمن کمیشن کی بحالی کا مقصد ۱۹۱۹ء کے ہندوستانی دستور کی کارکردگی کی بابت تحقیقات کرنا تھا۔ یہ کمیشن تمام تر برطانوی افراد پر مشتمل تھا۔جس کی وجہ سے ہندوستانیوں کے دلوں میں شکوک و بدگمانیاں بڑھ گئیں۔لہٰذا ''Go back Simon'' کا نعرہ بلند کیا گیا، بڑے بڑے جلسے ہوئے جن میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ کمیشن کو واپس بلا لیا جائے،تمام کاروبار روک دیا گیا اور مکمل طور پر اس کا سماجی بائیکاٹ کیا گیا۔ یہ بائیکاٹ اس قدر مؤثر تھا کہ کمیشن کے ممبران کو اسٹیشن سے خفیہ طور پر ان کے جائے قیام پر پہنچا دیا جاتا تھا۔ پولیس ان کی حفاظت کرتی تھی کہ مجمع کہیں انہیں گھیر نہ لے اور راستوں پر مظاہرین کو ان سے الگ رکھتی تھی۔ پولیس کی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی زیادتیوں کی وجہ سے سفا کی اور بربریت کے واقعات پیش آئے۔ بقول تاراچند:

> ''مجمعوں کو سخت دھکے دے کر پیچھے ہٹایا جاتا تھا اور ان پر لاٹھیاں برسائی جاتی تھیں۔ان میں سے دو واقعات تو ایسے ہوئے جن کی تمام ہندوستان نے مذمت کی۔۳۰/اکتوبر ۱۹۲۸ء کو لاہور میں اور دوسرا ۳۰/نومبر کو لکھنؤ میں پیش آیا۔ پہلے میں لاجپت رائے اور پنجاب کے کئی دوسرے

رہنما پولیس کے وحشیانہ حملے کا شکار ہوئے۔ اس حادثہ کے فوراً بعد لاجپت رائے کی موت، کہا جاتا ہے کہ انہیں چوٹوں کے باعث ہوئی جو دوران مد بھیڑ ان کو لگی تھی۔ لکھنؤ میں جواہر لال نہرو اور کئی دیگر ممتاز شہریوں سے ایسا ہی شرمناک برتاؤ کیا گیا۔'' (۱۴)

اس کمیشن کی بحالی نے عدم تعاون کی تحریک میں نئی روح پھینک دی کانگریس نے ہندوستان کی دیگر سیاسی جماعتوں کے مشورے سے ایک آئین تیار کیا جس میں ہندوستان کو ایک نو آبادیات کا درجہ دینے کا مطالبہ مندرج تھا۔ حکومت کی جانب سے کوئی تشفی بخش جواب نہ موصول ہونے پر جواہر لال نہرو کی صدارت میں بمقام لاہور میں ایک اجلاس منعقد کیا گیا جس میں جائز و پرامن ذرائع سے مکمل آزادی کے حصول کو اپنا نصب العین قرار دیا گیا۔

۱۹۲۴ء سے لے کر ۱۹۲۹ء تک مستحکم اتحاد کے لئے جو متعدد کوششیں کی گئیں وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ خلوص کے ساتھ اس مسئلے کا حل تلاش کیا جا رہا تھا۔

۱۹۲۳ء میں قومی معاہدہ، پھر اسی سال بنگال معاہدہ، ستمبر ۱۹۲۴ء میں اتحاد کانفرنس اور ایک اتحادی پنچایت کا قیام، نومبر ۱۹۲۴ء میں بمبئی کل جماعتی (آل پارٹیز) کانفرنس، ستمبر ۱۹۲۷ء میں شملہ میں اتحادی کانفرنس جس کی صدارت لارڈ ارون نے کی، ۱۹۲۷ء میں کانگریس کے زیر اہتمام ایک اتحادی کانفرنس، پھر مارچ اور مئی ۱۹۲۷ء میں دہلی میں منعقدہ کل جماعتی کانفنس جس میں موتی لال نہرو کی صدارت میں ایک کمیٹی بنادی تھی کہ وہ ہندوستان کے لئے ایک آئین تیار کرے۔ یہ سب باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ اتحاد کے لئے کتنی کاوشیں کی گئی تھیں۔

اس کے علاوہ یہ کوششیں صرف مخصوص کانفرنسوں تک محدود نہ تھیں، انڈین نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ جیسی مستقل تنظیموں نے اس عنقا کی تلاش میں بڑی سرگرمیاں دکھائیں لیکن افسوس کہ ناکامی ہی ہاتھ لگی۔ کئی مرتبہ تو ایسا معلوم ہوا کہ اب کامیابی ضرور مل جائے گی لیکن ساری امیدیں خاک میں مل گئیں۔

لہٰذا گاندھی جی کو پھر سے ستیہ گرہ کی مدد لینی پڑی۔ اسی اثناء میں ہندوستان کی جملہ جماعتوں کے اشتراک سے نہرو رپورٹ مرتب ہوئی تھی۔ بقول تاراچند:

''مدارس کانگریس کی قرارداد پر تعمیل کے طور پر ورکنگ کمیٹی نے فروری ۱۹۲۸ء کو مختلف سیاہی

پارٹیوں کی ایک میٹنگ دہلی میں طلب کی۔کانفرنس نے دستور کا مقصد یہ بتایا کہ ایک ذمہ دار حکو مت کا قیام عمل میں لانا ہے اور ایک کمیٹی مقرر کر دی کہ وہ دستور کی بعض تفصیلات متعین کر لے۔''(۱۵)

۱۹۲۸ء کی نہرو رپورٹ نے مسلم لیگ کو مایوسی میں ڈال دیا۔ ہندوستان کی دستور اساسی طے مانے کی غرض سے ایک کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی۔۱۹ر مئی ۱۹۲۸ء کو ہی موتی لال نہرو کی صدارت میں آل پارٹیز کانفرنس دوبارہ بمبئی میں منعقد کی گئی۔ جہاں یہ طے کیا گیا کہ مسلم لیگ اور ہندو مہا سبھا کے مابین اختلافات ہونے کے باعث یہ ضروری ہے کہ پہلے دستور کا اصل مسودہ تیار کیا جائے نیز اس کے خاص اصول مقرر کئے جائیں۔اس مقصد کی بازیابی کے لئے ایک کمیٹی (نہرو کمیٹی رپورٹ) کی بنیاد ڈالی گئی کہ وہ اپنی رپورٹ پیش کرے۔اس کانفرنس میں تیج بہادر سپرو،علی امام،شعیب قریشی،سبھاش چندر بوس،این. ایم. جوشی اور منگل سنگھ وغیرہ دیگر ممبران بھی شامل تھے۔رپورٹ کی سفارشات کو قومی مطالبے کا درجہ دینے کے لئے ضروری تھا کہ آل پارٹیز کانفرنس،مسلم لیگ اور انڈین نیشنل کانگریس کی تصدیق بھی حاصل کر لی جائے۔

دسمبر ۱۹۲۸ء میں بمقام کلکتہ ڈاکٹر انصاری کی صدارت میں کانفرنس کا تیسرا اجلاس ہوا اور ایک جنوری تک اس کی نشستیں ہوتی رہیں۔اس میں گاندھی جی،جناح،موتی ال نہرو،ہندو مہا سبھا کے لیڈر مالویہ،سپرو،ابوالکلام آزاد،اینی بیسنٹ اور علی امام وغیرہ جیسے پارٹیوں کے نامور لیڈر اور پبلک کے ممتاز لوگوں نے شرکت کی۔آل پارٹیز کانفرنس،انڈین نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ کے پیش نظر جو مقصد تھا وہ آزادی کا حصول تھا۔اس مقصد کو حاصل کرنے کی خاطر دونوں فرقوں کا اتحاد لازمی تھا۔لیکن جناح کے تجاویز کو ناکام بنانے میں مقصد کے بجائے ذرائع کو زیادہ اہمیت دے دی گئی۔جس کی وجہ سے دونوں پارٹیوں کے درمیان بدگمانی آ گئی۔مسلم لیگ کو اس رپورٹ کے بعض امور سے ناراضگی پیدا ہو گئی اور اس کے عوض میں چودہ نکات کی اپنی تجویز پیش کی۔ چنانچہ ۱۹۲۸ء کے بعد کانگریس اور مسلم کے درمیان ایسی خلیج پیدا ہوئی جس کی توسیع قیام پاکستان سے ہوئی۔گاندھی جی کے اطمینان کے باوجود نہرو رپورٹ ایک نوزائدہ بچہ ثابت ہوئی اور ایک سال کی کے عرصہ کے بعد ہی وہ آخری سانسیں لینے لگی۔اس عرصہ میں کلکتہ کانگریس کی قرارداد

کے بموجب گاندھی جی اس جدوجہد کی تیاری میں لگے رہے جو برطانوی حکومت کی جانب سے نہرو رپورٹ منظور نہ ہونے کی صورت میں کرنی پڑے گی۔

۱۲؍نومبر ۱۹۳۰ء کو بادشاہ جارج پنجم نے پہلی گول میز کانفرنس کا افتتاح کیا۔ حاضرین میں برطانوی پارلیمنٹ کے نمائندے، ہندوستانی مندوبین اور والیان ریاست ہائے ہند تھے اور برطانوی کامن ویلتھ کے ہائی کمشنر بطور مشاہدین شریک تھے۔ بادشاہ سلامت نے اپنے خطبے میں کامن ویلتھ کی حکومتوں کے نمائندوں کی موجودگی پر خاص توجہ صرف کی اور ان کی حاضری کو حق بجانب قرار دیا۔ وہ اس احساس کو شدت کے ساتھ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ ''آپ کے مذاکرات کے مسئلہ کا تعلق ساری برطانوی سلطنت سے کس قدر زیادہ ہے''۔ پہلی گول میز کانفرنس نے اس بات کو واضح کر دیا کہ تمام ہندوستانی بالاستثنائے ذات، پات، پارٹی، فرقہ یا مفاد کے اس مطالبے کے لئے ہم زبان تھے کہ ایک ہندوستانی کابینہ کو اختیارات منتقل کر دئے جائیں جو ایک منتخب شدہ مجلس قانون ساز کے سامنے جواب دہ ہوں۔ بہت سے لوگ اس پر راضی تھے کہ عبوری دور کے لئے چند کا تحفظات کا قائم رہنا اور اختیارات کو محفوظ رکھنا ضروری ہے۔ جہاں لندن میں پہلی گول میز کانفرنس ہو رہی تھی وہیں ہر صوبہ میں سول نافرمانی کی تحریک زوروں پر تھی۔ جس نے گورنمنٹ کو الجھن میں ڈال دیا۔ ہندوؤں نے کثیر تعداد میں اس تحریک میں حصہ لیا اور ہزاروں ہندوؤں سے جیلیں تک بھر گئیں۔ بہت سے مسلمانوں نے بھی گاندھی جی کی پیروی کی مثلاً عباس طیب جی، ابوالکلام آزاد، انصاری، سید محمود، تصدق احمد خاں شیروانی، رفیع احمد قدوائی اور عبدالغفار خان جنہوں نے خدائی خدمت گار کے نام سے رضا کاروں کا ایک دستہ تیار کر لیا تھا۔ ان کی للکار پر شمال و مغربی صوبے کی مسلم اکثریت اور بہت سے پٹھان قبیلے گورنمنٹ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور ہندوستان کی آزادی کے لئے جنگ کی۔ بہت سی دیگر مسلم تنظیموں مثلاً جمیعت العلماء، احرارلسلام، قوم پرست مسلم پارٹی نے بھی بڑی قربانیاں دیں۔ پہلی گول میز کانفرنس میں کانگریس شامل نہیں ہوئی لیکن دوسری گول میز کانفرنس منعقدہ ۱۹۳۱ء میں گاندھی جی نے کانگریس کی جانب سے نمائندگی کی تھی۔ مسلم لیگ کی کشیدگی گول میز کانفرنسوں میں بھی دور نہ ہو سکی۔ اگرچہ ۱۹۳۱ء کی دوسری گول میز کانفرنس میں کانگریس کی جانب سے گاندھی جی نمائندگی کی تھی۔ لیکن اس کانفرنس کے بعد جو صورتحال سامنے آئی وہ خلاف توقع تھی۔ تاہم فرقہ پرست جماعتوں کے

سامنے گاندھی جی بے بس ہو گئے تھے۔اس سے مسلمانوں کے احساسات کو صدمہ پہنچا۔

۲۲/مارچ ۱۹۳۰ء کا ناقبل فراموش واقعہ ''ڈانڈی مارچ'' جس میں گاندھی جی نے صوبہ گجرات کے ڈانڈی مقام پر نمک کا قانون توڑ کر نمک بنایا تھا تحریک عدم تعاون کی رہین منت ہے۔ بقول گاندھی جی:

> ''ہمارے لئے راستہ تجویز کیا جا چکا ہے۔ ہر گاؤں کو چاہئے کہ وہ اپنے سمندر کے ساحل سے نمک اٹھا لائیں یا خود بنائیں۔ لوگوں کو چاہئے کہ وہ شراب کی دوکان ،افیوں کے اڈوں اور غیر ملکی تاجروں کی دوکان پر دھرنا دیں۔ ہر گھر کے نوجوانوں اور بوڑھوں کو چاہئے کہ وہ خود تکلی چلائیں اور روزانہ ڈھیروں تاگا کاتیں اور بٹین۔ بدیشی کپڑا جلا دینا چاہئے اور ہندو چھوت چھات ختم کر دینا چاہئے۔ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی اور پارسی سب مل کر اتحاد پیدا کریں۔ پہلے اقلیت کو حق دینا چاہئے کہ وہ جو چاہیں لے لیں اور اس کے بعد جو کچھ بچے اس پر اکثریت کو قناعت کرنی چاہئے۔ طالب علموں کو چاہئے کہ وہ سرکاری اسکول اور کالج چھوڑ کر عوام کی خدمت میں لگ جائیں اس طرح ہم دیکھیں گے کہ پورن سوراج ہمارے قدموں میں آ گرے گا۔''(۱۶)

۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۱ء کے بیچ انگریزوں کی بربریت و مظالم کے باوجود یہ تحریک آگے بڑھتی رہی۔ برطانوی حکومت نے متعدد اصلاحات نافذ کرنے کے بعد ۱۹۳۲ء میں گاندھی جی کو گرفتار کر کے کانگریس پر حملہ کر دیا۔ کئی کانگریسی لیڈر اور تنظیم کاروں کو بھی گرفتار کر کے اس کی تمام کوششوں کو ناجائز قرار دے دیا۔ حکومت نے بڑے پیمانے پر تشدد کے ساتھ ساتھ لوگوں کو جسمانی اذیتیں بھی پہنچائی۔ گاندھی جی نے انگریزوں کو خاموش شکست دینے اور اور اپنے ساتھیوں کو حوصلہ دینے کی خاطر ''مرن برت'' رکھا۔ جس کی وجہ بتاتے ہوئے وہ فرماتے ہیں کہ:

> ''یہ میرے دل کی پرارتھنا ہے کہ میں اپنے اور اپنے ساتھیوں کے قلب کو پاک کر سکوں اور وہ ہریجنوں کی بھلائی کے کام میں زیادہ محنت اور توجہ دیں۔''(۱۷)

اس برت نے مختلف فرقوں کے رہنماؤں کے ضمیر کو جھنجھوڑ ڈالا اور اس کا حل نکالنے کی غرض سے دہلی میں ایک اتحاد کانفرنس بھی رکھی گئی۔ ۱۹۳۴ء میں گاندھی جی نے کانگریس کی رکنیت سے مستعفی ہو گئے۔ کانگریس کمیٹی نے دوبارہ گاندھی جی کو کانگریس کی قیادت سنبھالنے کی درخواست کی۔ گاندھی جی نے پر زور الفاظ میں انگریزی حکومت کی فرقہ وارانہ پالیسی کے متعلق کہا کہ انگریزی حکومت کے نزدیک ''پھوٹ

ڈالو اور حکومت کرو'' قابل فخر اصول رہا ہے ہندوستان میں فرقہ وارانہ کشیدگی اور ملک کی تقسیم کے پس پشت برطانوی حکومت ہی ذمہ دار ہے۔اب جبکہ ملک ان حالات سے نبرد آزما ہے اس وقت بدقسمتی سے کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان نہ پاٹی جانے والی خلیج موجود۔ گاندھی جی نے انگریزوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مزید کہا کہ اگر وہ ہندوستان سے چلے جائیں تو میں یقین دلاتا ہوں مسلم لیگ ،کانگریس اور دیگر پارٹیاں ہندوستان کے مفاد کی خاطر آپس میں سمجھوتہ کرلیں گی۔

ایک طرف ایمرے اور لن لتھ گو کانگریس کی مذمت اور ملامت کے پسندیدہ مشغلے میں مصروف تھے اور دوسری طرف قوم کے لئے اپنے کو وقف کرنے والے زائرین،سچائی اور صداقت، ہمدردی،عدم تشدد کے جام خونی تلاش میں بڑھ رہے تھے۔کثیر مقدار میں جدید ترین جان لیوا ہتھیاروں سے مسلح طاقت اور جرمن فوجیں روس کے وسیع میدانوں میں بڑھ رہی تھیں۔حواس باختہ یوروپ خوف واندیشوں میں بدقسمتی کے احساس کے ساتھ ساتھ جنگ کی برق رفتاری کو دیکھ رہا تھا جس کی وجہ سے روس ظاہر میں قلیل مدت میں ہی تہ وبالا ہو جاتا اور اپنی فتح کے نشے سے سرشار ہٹلر سارے یوروپ کو اپنے زیر نگیں لا کر جزائر برطانیہ فتح کرنے کے منصوبے پر عمل پیرا ہوتا۔ہٹلر کے روسی حملہ نے برطانوی اوسان اور ان کے ٹھنڈے ذہن کو برقرار رکھا۔سول نافرمانی کی تحریک اس زمانے تک جاری رہا جاپان کا خطرہ ہندوستان کی فضا اور اس کے ملحقہ سمندرو پر منڈلانے لگا۔الغرض کہ ملکی وغیر ملکی سطح پر جنگ وجدل کا ناختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔۱۹۳۹ء میں تیسری جنگ عظیم کی ابتداء ہوئی تو برطانوی پارلیمان نے کانگریس سے صلاح ومشورہ کئے بغیر ہندوستان کے جنگ میں شامل ہونے کا اعلان کر دیا جس سے ناراض ہوکر کانگریس نے کابینہ سے استعفٰی دے دیا۔

کانگریس اور مسلم لیگ میں روز بروز کشیدگی بڑھتی گئی۔ ۱۹۳۵ء کے آئین کے تحت کانگریسی اکثریتوں نے باہمی اشتراک سے حکومت بنانے کے منصوبوں سے انکار کر دیا۔کیونکہ مسلم لیگ کی ضد تھی کہ اس کے دو نمائندے کابینہ میں شریک کیا جائے جبکہ کانگریس دونوں پارٹیوں سے ایک ایک نمائندہ لینے کی تجویز پر قائم تھی۔مسلم لیگ کے راضی نہ ہونے پر کانگریس نے سلف کابینہ بنانے کی طرف غور کرنے لگی اور لیگ کو عہد نامے پر دستخط کے بعد ہی کابینہ میں شامل ہونے کی شرط رکھی۔کانگریس کے اس روسے سے لیگ کو

ہتک کا احساس ہوا۔اب مسلم لیگ مسلمانوں کی حمایت حاصل کرنے اور مختلف مسلم پارٹیوں کو اپنے میں ضم کرنے کی مہم میں لگ گئی۔نتیجتاً ۱۹۴۶ء کے انتخاب میں ۵۳۳ مسلم سیٹوں میں سے ۴۶۰ سیٹیں حاصل کی۔ وہیں مختلف صوبوں میں کانگریس نے قابض رہے۔اس انتخاب نے ہندو مسلم اتحاد میں نفاق کی لہر کو مزید ہوا دے دی۔اسی کی مخالفت میں ہندو مہا سبھا کا ظہور ہوا اور ان سے منسلک کئی پارٹیوں کی تشکیل ہوئی۔ان پارٹیوں نے سیاست کو مذہب میں منتقل کرنے کی روایتی کوششیں کی۔کئی لیڈروں کا خیال تھا کہ ہر شخص ہندو ہے جو سندھ سے لے کر سمندروں تک کے سرزمین کو اپنا وطن سمجھتا ہے اور اسے اپنی مقدس سرزمین اور اپنے مذہب کا گہوارہ مانتا ہے۔ہندو ہی مشترکہ قوم وتہذیب کے دعویدار ہیں۔ہندو اور مسلمان دونوں دشمن قومیں ساتھ ساتھ ہندوستان میں رہتی ہیں۔مہا سبھا کے نقطۂ نظر سے مسلمان اور عیسائیوں کو اقلیتی قوم میں شمار کرنا چاہئے۔وہ قومیت کے حقوق کے بجائے شہری حقوق کے دعویدار ہیں۔اس کے ردعمل میں جناح نے انھیں کے الفاظ میں ان کو جواب دیتے ہوئے اعلان کیا کہ:

> ''تاریخ، کلچر، قانون غرض کہ ہر لحاظ سے مسلمانان ہند ایک جداگانہ قوم۔ان میں اور ہندوؤں میں کوئی سماجی، ثقافتی یا مذہبی قدر مشترک سرے سے نہ ہے اور نہ آئندہ ہوسکتی ہے۔'' (۱۸)

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ تقسیم ہند کے محرکات میں فرقہ وارانہ تنظیموں کا بھی بہت بڑا ہاتھ تھا۔ایک طرف ہندو مہا سبھا کے کارکن کا یہ نعرہ کہ ''ہندوستان کی قوم صرف ہندو ہے اور یہاں رہنے والوں کو ہندو بن کر رہنا ہوگا۔تو دوسری جانب مسلم تنظیمیں جیسے مسلم لیگ، جمیعت علمائے ہند اور جماعت اسلامی نے بھی اعلان کر دیا تھا کہ مسلمان ایک الگ قوم کا درجہ رکھتے ہیں جس کی اپنی تہذیب وثقافت، زبان، لباس، رسومات، آداب واقدار اور عبادت وریاضت کے طور طریقے یکسر جداگانہ ہیں۔ مسلم لیگ نے اردو کو سارے ہندوستان کی زبان بنانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تو وہیں ہندو مہا سبھا نے سنسکرت آمیز ہندی کو ہندوستانی آئین کے نقطۂ نظر سے ضروری قرار دیا۔چنانچہ ہندو مسلم کے اس تفریق اور کانگریس کے بعض سیاسی رویّے سے اختلاف کے نتیجے میں جناح نے مسلمانوں کے حقوق واقدار کی تحفظ کی خاطر ایک علیحدہ ملک پاکستان کا مطالبہ شروع کر دیا۔۱۹۳۰ء میں تصور پاکستان اس وقت سامنے آیا جب کیمرج کے یونیورسٹی کی ایک طالب علم چودھری رحمت علی نے اسے پیش کیا۔اس طالب علم نے''

ابھی اور کبھی نہیں'' کے نام سے ایک پمفلٹ شائع کیا جس میں انہوں نے پاکستان کے تصور کی تشریح کی تھی۔ موجودہ ہندوستان کے پانچ مسلم اکثریت والے صوبوں کو ملا کر پاکستان بنانے کی تجویز رکھی گئی۔صوبہ پنجاب، افغانی خطہ، شمالی مغربی سرحدی صوبہ، کشمیر، سندھ اور بلوچستان شامل تھے۔ ہندوستانی مسلم لیڈروں نے ابتداء میں اسے ایک اسکولی لڑکے کا بچکانہ عمل قرار دے کر مسترد کر دیا۔لیکن جنگ کی صورتحال کی ابتری اور کانگریس کے روّیے کی سختی نے بہت جلد ان کے موقوف کو بدل دیا۔انھیں خدشات کی بنیاد پر ۱۹۴۰ء لاہور کانفرنس میں جناح نے بڑی عجلت میں علیحدہ ملک پاکستان کی تجویز پاس کر دی۔ جہاں تک پاکستان کے بنیادی مطالبے کا تعلق تھا، گاندھی جی نے اسے نامنظور کیا کہ انھیں اس سے اطمینان نہ تھا کہ جو مسلمان ان خطوں سے باہر غیر مسلم اکثریت کے ساتھ رہتے ہیں، ایک مختلف قومیت ہے۔ وہ جناح کے دوقومی نظر سے متفق نہ تھے۔ مسٹر جناح کا اصرار کہ ہندو اور مسلم (پنجابی، سندھی، پٹھان اور بلوچی) لسانی، نسلی، تہذیبی و تاریخی اعتبار سے دو مختلف اور جداگانہ قومیں ہیں۔ گاندھی جی نے حق خودارادیت اور ان دو علاقوں کے ہندوستان سے الگ ہونے کے حق کو تسلیم کیا اور پہلے ملک کی آزادی پھر تقسیم کے مسئلے پر گفت وشنید کی بات کی۔لیکن اس سے جناح مطمئین نہ ہوئے۔ وہ پہلے پاکستان اس کے بعد آزادی چاہتے تھے۔

مسلم لیگ ملک کی تقسیم جبکہ کانگریس متحدہ ملک کی آزادی کے لئے جدوجہد کر رہی تھی۔ ۱۹۴۶ء میں دونوں تحریکیں اپنے عروج پر تھیں۔انگریز ہندوستان کو جلد از جلد آزاد کرنا چاہتے تھے۔ وہیں مسلم لیگ کانگریس کے ساتھ مصالحت کے بجائے سورش و بے چینی کو بڑھانے کی کوشش کر رہی تھی تا کہ انگریزی حکومت اور کانگریس مجبور ہو کر پاکستان کے مطالبے کو تسلیم کر لیں۔لہٰذا انگریزوں نے ہندوستان کے مسئلے کو حل کرنے اور دونوں جماعتوں کے مابین اقتدار کی تقسیم کو روکنے کے لئے ۱۹۴۶ء میں کیبنٹ مشن بھیجا۔ان کے نزدیک اس وقت ہندوستان میں رہنے والے برطانوی افراد کے جان و مال کی حفاظت کرنا سب سے زیادہ ضروری تھا۔مسلم لیگ تقسیم ملک پر بضد رہی۔ چنانچہ حکومت نے ۲۰ر فروری ۱۹۴۷ء کو یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ جون ۱۹۴۸ء تک اقتدار ہندوستانیوں کو سونپ دیا جائے گا۔جس کی تشریح یوں ہے:

> ''جون ۱۹۴۸ء سے پہلے حکومت ذمہ دار ہندوستانی ہاتھوں میں منتقل کرنے مصمم ارادہ کر چکی ہے۔ اور اسے یہ سوچنا ہوگا کہ ہندوستان کی مرکزی اختیارات مقررہ تاریخ پر کس کو سونپے

جائیں۔ آیا مجموعی طور پر برطانوی ہند کی کسی مرکزی حکومت کو یا بعض علاقوں میں صوبائی حکومتوں کو۔ یا پھر کوئی اور طریقہ اختیار کرے جو سب سے معقول اور ہندوستانیوں کے لئے سب سے مفید معلوم ہو۔'' (۱۹)

اس وقت پورے ملک میں فرقہ وارانہ فسادات عروج پر تھا۔ اگست ۱۹۴۶ء کے درمیان مسٹر جناح نے ڈائریکٹ ایکشن ڈے منانے کا فیصلہ کیا جس نے دونوں فرقوں میں جنگی پیمانے پر انتشار پیدا کر دیا۔ سب سے پہلے کلکتہ کو نشانا بنایا گیا، بعد ازاں مشرقی بنگال اور بہار بھی اس کے لپیٹ میں آ گیا۔ جس میں نا معلوم کتنے بے گناہ لوگ قتل وغارت گری، بربریت، لوٹ مار کے زد میں آئے۔ بدقسمتی سے پنجاب کو اس ہولناک فسادات کا سب سے زیادہ نقصان اٹھانا پڑا۔ خوں ریزی وتشدد کی انتہا نہ رہی۔ اس کے علاوہ لاہور، امرتسر، ٹیکشلا اور راولپنڈی بھی فسادات کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔ ہندوستان کو ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچانے کی غرض سے بالآخر کانگریس نے پاکستان کے مطالبے کو تسلیم کر لیا۔ اس اعلان نے جلتے ہوئے شعلوں کو مزید بھڑکا دیا اگر چہ ہندوستان کی تقسیم کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ۱۴ر جون کو مولانا آزاد اور دیگر کانگریسی لیڈر کی مخالفت کے باوجود منظور کر لیا تھا۔ حالانکہ مولانا آزاد نے تقسیم کو روکنے کے لئے کافی جدو جہد کی۔ انہوں نے نہرو سے بھی واضح طور پر کہا تھا کہ اگر ہم نے اس تقسیم کو قبول کر لیا تو تاریخ ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گی اور اس کا الزام بھی کانگریس کو ٹھہرایا جائے گا۔ لیکن ان کی بات کا کوئی اثر نہرو، پٹیل اور نہ ماؤنٹ بیٹن پر پڑا۔ اس تقسیم سے ہندو، سکھ اور نہ بہت سے مسلمان متفق ہوئے۔ گاندھی جی کی وہ قسم کہ'' ملک کی تقسیم ان کی لاش پر ہوگی'' اپنی چوٹی کے چیلوں کے اصرار پر مایوسی، بیچارگی اور بے بسی کی نظر ہو گئی۔ انھیں مسلم لیگ کے اس شدید روسّے سے بے حد تکلیف پہنچی۔ فسادات اور تقسیم کے ایک بڑے محرک کا نام لارڈ ماؤنٹ بیٹن تھا جو مارچ ۱۹۴۷ء میں وائسرائے بن کر ہندوستان آیا۔ اس نے سیاسی حالات پر قابو پانے کے لئے ملک کے مختلف رہنماؤں سے گفت وشنید شروع کی۔ ماؤنٹ بیٹن کی نیت اور ارادے حقیقت سے کوسوں دور تھے۔ ان کے وعدے جو اس نے ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی اور قوت فیصلہ کی کمی سے کیا وہ بیکار اور غیر سود مند ثابت ہوئے۔ مولانا آزاد نے ایک ملاقات میں ماؤنٹ بیٹن سے گزارش کی تھی کہ تقسیم ملک کی منصوبہ بندی پر از سر نو غور وفکر کریں۔ تقسیم کے بغیر جب ملک کی ایسی حالت ہے تو تقسیم کے بعد

اس کی کیا صورتحال ہوگی ۔ایسے میں تقسیم کی تمام ذمہ داری برطانوی حکومت پر عائد ہوگی ۔جس پر ماؤنٹ بیٹن نے آزاد کو یقین دلایا تھا کہ فسادات کی نوبت نہیں آئے گی ۔میں کسی بھی طرح کی کوئی شرارت نہیں ہونے دوں گا اور اگر کوئی احتجاج ہوا بھی تو وہ ہتھیار سے لیس پولیس،فوج، ٹینک وتوپ کا سہارا لے گی ۔تمام دعوے کھوکھلے ثابت ہوئے ۔اس کے برعکس نہ صرف فسادات ہوئے بلکہ بڑے پیمانے پر خون کی ہولی بھی کھیلی گئی ۔ ہندوستانی فوج نے بھی فرقہ وارانہ منافرت کا ثبوت دیا۔وہ جناح کی دھونس کے آگے سپر انداختہ ہوگئے ۔اتحاد کے حصول کو ماؤنٹ بیٹن کے عاجلانہ فیصلے نے ختم کر دیا۔لہٰذا جون ۱۹۴۷ء کو ماؤنٹ بیٹن نے تقسیم ہند کی سفارش پیش کی ۔ برطانوی پارلیمان نے جولائی ۱۹۴۷ء کو ''انڈیا فریڈم ایکٹ'' نافذ کیا جس کے تحت ہندوستان اور پاکستان کے نام سے دو آزاد ملکوں کا قیام عمل میں آیا۔ چنانچہ مقررہ وقت سے پہلے ۱۴/ اگست ۱۹۴۷ء پاکستان کو ایک خودمختار ملک قائم کر دیا گیا اور ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان طویل عرصے کے بعد برطانوی حکومت کی جبر وظلم سے آزاد ہوا۔لیکن ملک کی اس تقسیم اور اس کے افسوسناک نتائج کے باعث آزادی کی مسرت خاک میں مل گئی ۔

بقول پین چندرا:

> "The pride and joy in th eachievement of freedom was diluted by the pain and sadness of partition and the consequences of partition."(20)

مولانا آزاد اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> '' جب تقسیم ہوئی تو ملک میں خون کی ندی بہا دی گئی، معصوم مرد،عورت اور بچے قتل کئے گئے، ہندوستانی فوج بھی منقسم ہوگئی اور ہندوؤں نے مسلمانوں کے قتل کو روکنے کے لئے کوئی مناسب قدم نہیں اٹھائے ۔''(۲۱)

ان تمام مباحثوں، کوششوں اور قربانیوں کے باوجود بالآخر ہندوستان دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔آزادی کا وہ خواب جو ملک کے جانباز شہیدوں نے دیکھے تھے اس کی تعبیر فسادات اور ہجرت کی صورتوں میں ملی،اور وہ بھی اس طرح کہ انسانیت کی ساری حدیں ٹوٹ گئیں اور برادر وطن ایک دوسرے کے

خون کے پیاسے ہوگئے ۔ پرچم آزادی خون سے لت پت ہوگیا۔ چاروں طرف قتل وغارت کا بازار گرم ہو گیا۔اس ہولناک تباہی و بربادی نے پوری نسانیت کوشرمسار کردیا۔عورتیں، بچے، بڑےاور بوڑھے ہرایک اس المناک سانحہ سے متاثر ہوئے۔ عصمتیں لوٹی گئیں، کئی ماؤں کی گودسونی ہوئی، بے شمارعورتوں کواغوا کیا گیا، لاکھوں عورتیں بیوہ ہوئیں ۔تقسیم ملک کی وجہ سے وسیع پیمانے پر فسادات اورہجرت کے سنگین و اندوہناک واقعات رونما ہوئے۔جس نے جسم کے ساتھ ساتھ روح کوبھی کاری ضرب لگائی۔سینکڑوں کی تعداد میں تبادلۂ آبادی کا سلسلہ شروع ہوا۔مشترکہ تہذیب، مذہبی رواداری، مروجہ نظام کا شیرازہ بکھر گیا۔ غرض کہ انگریزوں کی فرقہ وارانہ پالیسی ''پھوٹ ڈالوحکومت کرو'' نے ہندومسلم اتحادواتفاق کودرہم برہم کر کے دل سوزاورشرمناک واقعات میں منتقل کردیا جس کے منفی نتائج کی کوئی انتہانہ رہی۔ یہ تھی تقسیم کی قیمت جو برصغیرکواپنے خون سے چکانی پڑی۔ مذہب اورفرقہ پرستی کی بنیاد پرخونی فسادات کا سلسلہ آج بھی بدستور جاری ہے۔

حواشی

(۱) انقلاب اٹھارہ سوستاون، پی. سی. جوشی، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۳ء، ص: ۱۴۰

(۲) تاریخ تحریک آزادی ہند، تاراچند، مترجم عدیل عباسی، جلد۳، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء، ص: ۴۰۵

(۳) تاریخ تحریک آزادی ہند، تاراچند، مترجم عدیل عباسی، جلد۳، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء، ص: ۴۲۰

(۴) ہندوستان کی سیاست کی تمہید، ڈبلو۔سی۔ بنرجی، حیدرآباد پبلشرز، حیدرآباد، ۱۹۸۴ء، ص: ۶۸

(۵) بحوالہ اردو ناول اور تقسیم ہند، عقیل احمد، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۱۹۸۷ء، ص: ۱۸

(۶) ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں، ڈاکٹر سید عابد حسین، دہلی، ص: ۸۹

(۷) ہماری آزادی، مولانا ابوالکلام آزاد، ترجمہ محمد مجیب، اورینٹ لونگ مین، بمبئی، ۱۹۶۱ء، ص: ۲۸

(۸) تاریخ تحریک آزادی ہند، تاراچند، مترجم عدیل عباسی، جلد۳، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء، ص: ۶۴۴

(۹) تقسیم ہند اور اردو افسانہ، ڈاکٹر ظفر سعید، سبزی باغ، پٹنہ، ۲۰۰۰ء، ص: ۲۱۸

(10) Agent of independence, by A.K.majumdar, Bhartiya VidyaBhawan, Chowpatty, Bombay, 1963, page 72

(۱۱) تاریخ تحریک آزادی ہند، تاراچند، مترجم عدیل عباسی، جلد۳، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء، ص: ۶۸۴

(۱۲) تاریخ تحریک آزادی ہند، تاراچند، مترجم عدیل عباسی، جلد۳، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء، ص: ۶۷۵

(۱۳) تاریخ تحریک آزادی ہند، تاراچند، مترجم عدیل عباسی، جلد۳، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء، ص: ۶۰۱

(۱۴) تاریخ تحریک آزادی ہند، تاراچند، مترجم ڈاکٹر ایم ہاشم قدوائی، جلد۴، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء، ص: ۱۶۴

(۱۵) تاریخ تحریک آزادی ہند، تاراچند، مترجم ڈاکٹر ایم ہاشم قدوائی، جلد۴، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء، ص: ۲۰۷

(۱۶) مہاتما گاندھی، بی۔آر۔آنند، علی جواد زیدی، حیدرآباد پبلشرز، حیدرآباد، ۱۹۸۴ء، ص: ۲۱۱

(۱۷) گاندھی جی کے تعلیمی خیالات، ڈاکٹر سعید انصاری، گاندھی سمارک، نئی دہلی، ۱۹۷۵ء، ص: ۹۵

(۱۸) ہندوستانی مسلم سیاست پر ایک نظر، ڈاکٹر محمد اشرف، دہلی، ۱۹۶۳ء، ص: ۵۱

(۱۹) ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں، ڈاکٹر سید عابد حسین، دہلی، ص: ۱۹۱

(20) Freedom Sttruggle by Bipan Chandra, Amlesh Tripathi, Barun De, N.B.T.I. Delhi 1962, page 228

(۲۱) ایڈوانس فریڈم، مولانا آزاد، مترجم ریاض الرحمٰن شیروانی، جہانگیر آفسیٹ پریس، نئی دہلی، ۲۰۰۲ء، ص: ۱۲۰

باب دوم

تقسیم ہند سے متعلق فسادات اور خواتین

فرقہ واریت کے لفظ سے ہر خاص وعام نہ صرف واقف ہیں بلکہ اس عظیم سانحہ سے گزر بھی چکے ہیں۔ کتنے ہی افراد کو اپنے گھر، خاندان حتیٰ کہ اپنی شخصیت تک کی قربانی دینی پڑی۔ آج یہ لفظ اتنا طاقتور بن چکا ہے کہ اسکی وجہ سے حکومتیں ٹوٹ بھی جاتی ہیں اور برسر اقتدار بھی آجاتی ہیں۔ فرقہ پرست عناصر نے پورے ملک میں اپنی جڑیں اتنی گہری کر لی ہیں کہ اب یہ موضوع تحقیق کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ فرقہ پرستی اس وقت وجود میں آتی ہے جب کوئی شخص اپنی تنظیم، تہذیب، ذات، رسم ورواج، عقائد، اور اصول و تاریخ کو حرف آخر سمجھنے لگے، اسے اہمیت دینے اور مشہور کرنے کے شوق میں دیگر مذاہب وعقائد اور اصول وتواریخ کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ یہ صرف انسان نہیں بلکہ انسانیت کو بھی ریزہ ریزہ کر دیتی ہے، اور انگریز اس بات سے اچھی طرح واقف تھے۔ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب جو اس ملک کی سب سے بڑی طاقت تھی اور جسے توڑنا یا ختم کرنا اتنا آسان نہ تھا۔ انگریزوں نے اسی ریڑھ کی ہڈی پر کاری ضرب لگائی۔ اس کی نیو ہلا ڈالی۔ ملک کی تقسیم اور اس کے نتیجے میں ہونے والے فسادات، ہجرت اور قتل وغارت سے انسانیت آج تک کراہ رہی ہے۔ ہندوستان میں فرقہ واریت پرانی نہیں ہے اور نہ ہی ۱۹۴۷ء کا فرقہ وارانہ ماحول یکا یک پیدا ہوا بلکہ یہ دور جدید کی دین ہے۔ اسکی ابتدائی نشوونما کا سراغ عموماً انگریزوں کے داخلۂ ہند اور خصوصاً جنگ آزادی کی پہلی ناکام کوشش یعنی ۱۸۵۷ء کے بعد سے ملتا ہے۔ فرقہ پرستی کا بیج انگریزوں نے ڈالا اور یہ پودا ۱۸۵۷ء کے بعد ایک تناور درحت کی شکل اختیا کر گیا۔ اس پالیسی کو ''ڈیوائڈ انڈ رول'' کے نام سے موسوم کیا گیا۔ یعنی ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو''۔ جو آگے چل کر ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کے زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ فرقہ واریت کے ضمن میں پون چندریوں رقمطراز ہیں:

> ''فرقہ واریت کا تعلق نہ تو ماضی سے ہے اور نہ ہی عہد متوسط سے۔ یہ ایک جدید نظر ہے جس کی تشکیل میں ماضی کے کچھ خیالات، اداروں اور تاریخی پس منظر نے اسے ایک نیا تصور اور سیاسی رنگ دیدیا ہے۔''(۱)

فرقہ واریت بھی دور جدید کی پیداوار ہے جسے مورخین نے جھوٹی تعبیر کر کے عہد قدیم اور عہد متوسط سے سے جوڑ دیا ہے، اور اسے ہندو، مسلم، سکھ وعیسائی کے مختلف خانوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ تاریخ کو مذہبی نقطۂ نظر سے پیش کرنے والے مورخین میں بیشتر انگریز تھے، جنھوں نے اپنی تحریر میں ذات، نسل، رسم، مسلم، ہندو، سکھ، عیسائی، برہمن، مراٹھی اور بنگالی کا فرقہ وارانہ طور پر استعمال کیا۔ انگریزوں نے اپنا اقتدار بنانے نے لئے نفاق قائمکر نے کی اسی پالیسی کو اپنایا۔ اس سازش کا شکار بہت آسانی سے ہندوستان کی دو نوں بڑی قومیں (ہندو اور مسلم) ہوگئیں۔ رفتہ رفتہ اس آسیب نے ایک بھیانک روپ دھار لیا اور آخر کار اس نے ملک کے دو ٹکڑے کر دئے۔ آہستہ آہستہ اس آگ نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مختلف ذاتوں اور طبقوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ فرقہ واریت کی آندھی نے اس آگ کو مزید ہوا دی اور اس کی چنگاری عیسائیوں، سکھوں، بودھوں اور جینوں تک پہنچ گئی۔ فرقہ واریت نے جس طرح کل ہندوستان کو مختلف جہتوں سے نقصان پہنچایا جس سے اب بھی نجات نہیں ملی ہے، آنے والے کل سے ہندو یا مسلمان ہی نہیں بلکہ پورا ملک فکرمند ہے۔

ادب صرف ایک لطیف ذریعۂ اظہار ہی نہیں ہے، بلکہ تاریخ کا آئینہ دار بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم اردو ادب کی کسی صنف کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ ہمارے لئے صرف تفریح کا سامان نہیں کرتی، بلکہ اس کے ذریعہ ہمیں تاریخی، تہذیبی اور سماجی شعور بھی حاصل ہوتا ہے۔ اردو ادب کے تناظر میں جب ہم صنف ناول کی بات کرتے ہیں تو ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہ صنف آغاز سے ہی اپنے عہد کی تہذیبی وثقافتی، سماجی وسیاسی زندگی کا بہترین ترجمان رہی ہے۔ ناول سماجی زندگی کا بے حد مؤثر اور قوی وسیلۂ اظہار ہے۔ چاہے وہ ۱۸۵۷ء کے بعد شکست وریخت کا دور ہو، جہاں ڈپٹی نذیر احمد، سرشار، رسوا، شرر و پریم چند جیسے ناول نگاروں نے اصلاحی، معاشرتی اور تاریخی ناولوں کے ذریعے اپنے عہد کی عمدہ ترجمانی کی۔ یا ترقی پسندی کا دور، جس میں سجاد ظہیر، کرشن چندر، عصمت چغتائی اور ان کے ہم عصر ناول نگاروں نے سماجی وسیاسی، تہذیبی واقتصادی مسائل عکاسی کی۔ یا پھر تقسیم ہند کے بعد تشدد وانتشار کا دور ہو۔ غرض کہ ہر عہد کے ناول نگاروں نے اپنے ناولوں میں حالات وواقعات کے مطابق معاشرے کے حقائق ومسائل کی حقیقی تصویر کشی کی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہندوستان کی تقسیم اور اس کے فوراً بعد فسادات کے سلسلے ایک با قائدہ سیاسی منصوبہ بندی کے نتائج تھے۔ باوجود اس کے بہت کچھ سیاست کے قابو سے باہر ہو جایا کرتا ہے، خواہ وہ ۱۹۴۷ء کا حادثہ ہو، ۱۹۹۲ء کا یا پھر ۲۰۰۱ء کا۔ اس طرح کے حادثات وواقعات کا اثر ادب پر بھی پڑنا لازم ہے سو اس پر بھی پڑا۔ لہٰذا تقسیم وفسادات کے موضوع پر بہت سے افسانے، ناول، یادداشت نامے اور مضامین وجود میں آئے۔ اس کے علاوہ نظمیں، غزلیں اس حادثاتی سلسلے کی وجہ سے تخلیق ہوئیں۔ یہ مسئلہ چونکہ انسانی کرب اور انسانیت کے زوال سے تعلق رکھتا ہے لہٰذا ہندوستانی ادبیات نے تقسیم ملک، فسادات، ہجرت، بازآبادکاری، تہذیبی بحران، سیاسی ہنگامہ خیزی اور نوسٹلجیا کو اپنا پسندیدہ موضوع بنایا۔ اگر یہ عظیم حادثاتی سلسلہ ظہور پزیر نہ ہوا ہوتا تو ہندوستانی ادبیات بالخصوص اردو نثر کا دامن نہ صرف کہ صرف تنگ ہوتا بلکہ اس کی کائنات بڑی حد تک نے رنگ بھی ہوتی۔ ادب نے اس تاریخ ساز واقعات کو اپنے آغوش میں سمیٹ لیا۔ ادب میں واقعات وحادثات کے ساتھ ساتھ ظالموں کے ظلم اور مظلوموں کی تکالیف بھی محفوظ ہوئیں۔ ٹوٹنے بکھرنے، جڑنے سنورنیکے مراحل طے کرتے انسانوں کی حیات بھی محفوظ ہوئیں۔ ایک نہایت نازک اور پیچیدہ اجتماعی تجربات کا مجموعہ جس میں تقسیم کا درد، ہجرت وجلاوطنی، خانہ برداری، عصمت دری، جدائی گویا کہ ایک قیامت سے گزرنے اور گزارنے والوں نے بربریت اور برداشت دونوں کی منتہاؤں کا عملی نمونہ پیش کیا۔ فساد وہجرت کے مرحلے طے کرنے کے بعد جتنے لوگ زندہ رہے ان سب کے دردوغم کا احتساب تو ناممکن ہے البتہ فسادات کے داخلی وباطنی زخم کا وسیلہ بن گئے۔ منٹو، بیدی، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، عصمت چغتائی، عبداللہ حسین، کرشن چندر، حیات اللہ انصاری، راما نند ساگر، خدیجہ مستور، جمیلہ ہاشمی، عبدالصمد وغیرہ ادیبوں کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جن کے ذہن میں یہ اندوہناک واقعہ اس طرح سے رچ بس گیا تھا، جس کی شدت کو انہوں نے تصنیف وتخلیق کی صورت میں پیش کیا۔

تقسیم ہند کے المیے نے سماج اور اس سے وابستہ دیگر شعبے وادارے کو شدید طور پر متاثر کیا۔ جس میں ادب بھی شامل تھا۔ تقسیم ہند کے حادثات وواقعات کا سب سے مؤثر اظہار اردو ادب کے ذریعے ہی ہوا۔ اس عہد میں برپا ہونے والے فسادت اور اس کی ہولنا کیوں کو تمام تخلیق کاروں نے اپنی تخلیق کا موضوع بنایا۔ اس موضوع پر جتنے بہترین فن پارے اردو زبان وادب میں تخلیق ہوئے وہ کسی ہندوستانی زبان میں نہ

ہوسکا۔فسادات، قتل وغارت گری اور زبردست تباہی کا احساس تمام ادیبوں اور دانشوروں کے دل ودماغ میں شدت سے پیدا ہوا۔ چنانچہ انہوں نے کھل کر اپنے جذبات واحساسات کا اظہار کیا۔ بقول عقیل احمد:

''برصغیر کی تقسیم نے لاکھوں افراد کو گویا ایک تہذیبی اور معاشرتی نیند سے بیدار سے جھنجھوڑ کر بیدار کردیا اور وہ اپنے ماحول کو یوں دیکھنے لگے جیسے پہلی بار دیکھ رہے ہوں۔''(۲)

اردو ناول اس سانحہ عظیم سے بے حد متاثر ہوا۔ ناول نگاروں نے بھی اس تلخ وناقابل فراموش عہد کے فسادات اور اس سے پیدا ہونے والے مختلف النوع پیچیدگیوں اور مسائل کو طویل عرصے تک ناول کا موضوع بنایا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد اردو میں کثرت سے ناول لکھے گئے۔ وقار عظیم ان ناولوں کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''تقسیم کے بعد کے زمانے میں اردو میں جتنے ناول لکھے گئے ہیں اتنے اردو ناول کی تاریخ کے کسی دور میں بھی نہیں لکھے گئے.....ان میں تاریخی، معاشرتی، اخلاقی، نفسیاتی مختلف طرح کے ناول شامل ہیں لیکن ان سے بھی پہلیان ناولوں کا نمبر ہے جنہیں ہم فسادات کے افسانوں اور نظموں کی طرح فسادات کے ناول بھی کہہ سکتے ہیں۔ فسادات کے ان ناولوں کا تقسیم سے ذرا پہلے اور اس کے ذرا بعد کا وہ مختصر زمانہ ہے جس میں انسان نے جی بھر کے انسانی خون سے ہولی کھیلی اور اپنے لباس کے ساتھ اپنے جسم وروح تک کو اس کی سرخی میں آلودہ کیا۔''(۳)

ڈاکٹر سید عبداللہ نے ۱۹۴۷ء کے بعد کے ناولوں کا تجزیہ ان جملوں میں کرتے ہیں:

''۱۹۴۷ء کے بعد کے ناولوں میں موضوع کے لحاظ سے خاصا تنوع ہے مگر سب سے بڑے موضوع دو ہیں۔ اول فسادات دوم تاریخی واقعات۔ ان میں سے فسادات کے ناول تو ۱۹۴۷ء کے فسادات وحوادث سے متعلق ہیں۔ اور تاریخی ناول ان نئے احساسات کے رہین احسان ہیں جن کے زیر اثر پاکستان وجود میں آیا۔''(۴)

ظاہر ہے کہ اس وافر تعداد میں لکھے گئے ناولوں کے موضوعات بھی مختلف رہے ہیں لیکن ان پر فسادات اور تاریخ کے واقعات کا غلبہ رہا ہے۔ دراصل خود فسادات بھی دور حاضر کی تاریخ سے تعلق رکھتے ہیں اور اس اعتبار سے وہ ناول جن میں تحریک آزادی کا پس منظر بیان کرتے ہوئے ملک کی آزادی اور ساتھ ساتھ بٹوارے کی وجہ سے رونما ہونے والے فسادات اور ان کی ہولناکیوں کا ذکر ملتا ہے وہ بھی تاریخی

ناول ہی کے زمرے میں آتے ہیں۔فرق صرف اتنا ہے کہ ان میں دور حاضر کی تاریخ بیان کی گئی ہے اور دوسرے تاریخی ناولوں میں ماضی بعید کے واقعات کا ذکر کیا گیا ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد حسن:

''اس پورے دور میں دو طرح کے ناول لکھے گئے ہیں۔ایک وہ جن میں کسی نہ کسی طرز سے معاشرتی کیفیات اور سماجی اور سیاسی صورت حال زیر بحث آئی ہے ان کا سلسلہ تقسیم ہندوستان سے یا اس سے قبل سے شروع ہو کر بنگلہ دیش سے ہوتا ہوا فسادات اور مختلف قسم کے مذہبی اور غیر مذہبی آویزشوں اور ٹکراؤ تک پہنچتا ہے۔ان آویزشوں کی نوعیت پیچیدہ سہی مگر ان کی حقیقت سے انکار ممکن نہیں۔دوسرے وہ جن میں اقتدار شکست وریخت کا بیان ہے اور زور ان کے پس منظر یا سماجی محرکات پر نہیں ہے اور اسی لحاظ سے دونوں ناولوں میں انداز بیان، کردار نگاری، واقعہ نگاری حتیٰ کہ کالموں تک کی نوعیت تبدیل ہو جاتی ہے۔''(۵)

آزادی کے بعد کچھ ایسے بھی ادبی نمونے وجود میں آئے جن میں نہ گہرائی تھی اور نہ ہی دور تک ساتھ نبھانے کی صلاحیت بلکہ ان میں جذباتیت کا غلبہ حاوی تھا۔ یہ فسادات کا فوری ردعمل تھا جو سطحی ناولوں میں ظاہر ہو رہا تھا،اس میں فسادات کو براہ راست موضوع بنایا گیا۔مثلاً ''رقص ابلیس''(ایم اسلم)،''خون''، ''بے آبرو''اور''فردوس''(قیس رامپوری)''مجاہد''(رئیس احمد جعفری)''خاک اور خون''(نسیم حجازی) وغیرہ یہ تمام ناول وقتی جذبوں اور ہنگامی صورت حال کی عکاسی کرتے ہیں۔ان ناولوں میں تھوک مقدار میں جذبہ فروشی کی گئی ہے۔نسیم حجازی نے تلوار ایک ہاتھ سے چھین کر دوسرے ہاتھ میں دے دی ہے۔دوسری قسم کے ناولوں میں موضوع اور مواد کے اعتبار سے ایسے ناول بھی تھے جن میں مسئلہ کے حل کے طور پر ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا گیا،سیکولرزم کا سبق یاد دلایا گیا اور انسانیت کی دہائی دی گئی۔کسی بھی فرقے کے خلاف لکھنے کے بجائے انسان کی درندگی کے خلاف لکھا گیا،تعصب اور جانبداری سے اوپر اٹھ کر ترازو کے دونوں پلڑے برابر رکھنے کی سعی کی گئی۔فرقہ وارانہ عصبیت اور جنون کے اس دور میں انسان دوستی، ہمدردی، خلوص وایثار کے حالات وواقعات کو اس وقت کا ایک پسندیدہ ومشہور موضوع تسلیم کیا گیا۔تیسرے قسم کے ناولوں میں فسادات اور عوامل ومحرکات کو سمجھنے کی کوشش کی گئی اور اسے تہذیبی زوال اور انسانی درد کے حوالے سے پیش کیا گیا۔ان ادیبوں اور فنکاروں میں سرفہرست قرۃ العین حیدر،عبداللہ حسین، جمیلہ ہاشمی، انتظار حسین اور خدیجہ مستور وغیرہ کے نام قابل ذکر اور اہم ہیں۔

ملک کی تقسیم اور فسادات کے موضوع پر اردو میں متعدد ناول لکھے گئے۔ ناولوں کے اس قطار میں دو ناول کچھ مختلف ہیں اور آزادی کے بعد پروان چڑھنے والے طرز احساس کی طرف انحرافی قدم بھی۔ ابراہیم جلیس نے ''دو ملک ایک کہانی'' اور راما نند ساگر نے ''اور انسان مر گیا'' میں کس قدر متوازن رویہ اور ایک مخصوص تجربے کو انہوں نے اس شدت یا گہرائی میں جا کر نہ دیکھا یا محسوس کیا جو ''میرے بھی صنم خانے'' ''آگ کا دریا'' اور ''اداس نسلیں'' میں ملتا ہے۔

برصغیر کی آزادی کے ساتھ اس کی تقسیم تاریخ ہند کا ایک عظیم سانحہ ہے۔ ہندوستان کی آزادی اگرچہ یہاں کے باشندوں کے لئے خوشی کا پیغام لے کر آئی، اس نے غلامی کی زنجیر سے ہندوستانیوں کو آزاد کیا۔ لیکن یہ بھی ایک ناقابل فراموش حقیقت ہے کہ ۱۹۴۷ء کے سانحہ نے ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کر کے فرقہ واریت، قومی عصبیت اور منافرت کو تقویت بہم پہنچائی۔ اس نے فرقہ وارانہ فسادات کی اس لعنت کو جنم دیا جس کے تحت انسانیت کے دشمنون نے انسانوں کے خون سے ہولی کھیلی۔ سینکڑوں گھر نذر آتش ہوئے۔ خوش حال اور ذی حیثیت خاندان فسادات کی زد میں آ کر تباہ و برباد ہو گئے وہیں عورتیں ان فسادات میں سب سے زیادہ متاثر ہوئیں۔ بے شمار عورتوں کو اغوا کیا گیا، شیر خوار بچے اپنی ماؤں کی یاد میں رونے اور بلکنے لگے۔ کئی عورتوں کی گود سونی ہو گئی تو دوسری طرف انسانوں نے وحشی درندوں کا روپ دھار کر دوشیزاؤں کی عصمت دری سے اپنی جنسی ہوس کی بھوک مٹائی۔ انکے آنچل کو داغدار کیا اور پرچم آزادی خون سے لت پت ہو گیا۔ اس طرح پورے ہندوستان میں آگ اور خون کی ہولی کھیلی گئی۔ فرقہ وارانہ نظام قائم ہونے کے بعد ہندوستان کا معاشرتی، معاشی اور تہذیبی و اخلاقی شیرازہ بالکل بکھر گیا۔ سیاسی حالات نے نئے مسائل کو جنم دیا۔ فرد اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگا۔ معاشرے میں متضاد پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔ زندگی کی قدریں بدل گئیں۔ اور ان متغیر قدروں کے درمیان عورتوں کو سب سے زیادہ ظلم و ستم کا نشانا بنایا گیا۔ کیونکہ وہ بے بس، لاچار اور جذباتی طور پر بھی سب سے زیادہ حساس اور کمزور ہوتی ہیں لہٰذا انہیں اس تقسیم میں ملنے والی آزادی کی قیمت اپنی عزت و آبرو سے چکانی پڑی۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ شروعات سے ہی ہر سطح پر عورتوں کو قربانی کی صلیب پر چڑھایا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مرد اور عورت دونوں ہی کا وجود ایک دوسرے کی تکمیل اور بقائے بنی نوع انسان کے لئے ناگزیر ہے لیکن اگر انسانی صفحات کو الٹ کر دیکھیں تو یہ حقیقت

آشکار ہو جاتی ہے کہ یہ ناانصافی مردوں سے اکثر سرزد ہوتی آئی ہے۔ مردوں نے عورتوں کے وجود اور اس کی اہمیت کو اگر قبول کیا بھی تو ذاتی مفاد کی خاطر اور جب کبھی انہوں نے عورتوں کے حقوق کی بات بھی کی تو اس کے پس پردہ عموماً عورتوں کا استحصال تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب جب زمانے میں تغیر و تبدل کے نام پر جنگیں ہوئیں ہیں ہمیشہ بے بس و کمزور طبقہ بالخصوص عورتوں کو خسارہ اٹھانا پڑا ہے۔ ماں، بیٹی، بیوی ان سبھی کی عزت کو تار تار کیا گیا ہے۔ سماجی مساوات اور حق و انصاف کی بات کرنے والے سماجی ٹھیکیداروں اور منصفوں نے عورتوں کو مساوات تو کیا ان کے حقوق و فرائض کو بے انصافی، جبر و ظلم، استحصال اور ناانصافی کے اندھے کنویں میں ڈھکیل دیا۔ عورتوں کی حیثیت اور مقام میں روز اول سے اب تک کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ عورتوں نے اپنے حقوق اور سماجی مساوات کی بازیابی کے لئے ان مردوں کو آئینہ ضرور دکھایا ہے جنہوں نے ان کے وجود کی نفی کرتے ہوئے سماج میں ان کی ثانوی حیثیت مقرر کی اور سرے سے ان کی حق تلفی اور زیادتی کی۔ لیکن یہاں بھی عورتوں کو بخشا نہ گیا۔ آئے دن ہونے والے واقعات و حادثات اس امر کی دلیل پیش کرتے ہیں۔ جنس کی بنیاد پر ان کیساتھ امتیازی سلوک، ظلم و زیادتی اور استحصال ہوتا آرہا ہے۔ قدیم زمانے میں عورتوں کو کوئی باعزت مقام حاصل نہ تھا۔ ان کی سماجی زندگی کا کوئی بھی پہلو ایسا نہ تھا جہاں ان کے ساتھ ظلم و ستم کا برتاؤ نہ رکھا گیا ہو مگر اس بربریت اور ناانصافی کے باوجود یہ بے بس عورتیں مردوں کی حاکمانہ سرپرستی اور جابرانہ اقتدار کے زیر سایہ زندگی بسر کرتی رہیں۔ یہ ایک ایسا ظالمانہ اور غیر منصفانہ دور تھا جہاں عورتوں کی لب کشائی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ وہ مردوں کی تمام خرمستیوں اور زیادتیوں کو اپنے دل پر پتھر رکھ کر سہہ لیتی تھیں۔ غرضیکہ عورت کی اپنی کوئی شخصیت اور کوئی زندگی نہ تھی۔ وہ محض مردوں کی ملکیت تھی بلکہ اس سے بھی بدتر حالت میں تھی۔ وہ مردوں کی نظر میں انتہائی حقیر اور ذلیل شے کی مانند تھی۔ مرد اس کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک کرتا۔ عورت کے ساتھ مردوں کے وحشیانہ سلوک کی حقیقت پر مبنی داستان کافی طویل اور لرزہ خیز ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جب مرد نے رشتوں کو پہچانا تو اسے اپنی طاقت، برتری، شان اور انا کا احساس ہوا اور وہ لفظ بیٹی سے نفرت کرنے لگا اور اسے زندہ درگور کر دیا۔ تعجب اور اس سے کہیں زیادہ افسوس و شرمندگی کی بات ہے کہ جس جیتی جاگتی ہستی کے رحم سے وہ نکلا، بڑا ہو کر اسی کو زندہ نگل گیا، اس کی شناخت، حیثیت، شخصیت حتٰی کہ اس کی زندگی کو ریزہ ریزہ کر دیا، اسے توڑ

مروڑ کر کر زندہ لاش بنا دیا۔ کبھی مندر میں درگا اور لکشمی کے سند پر بٹھایا تو وہیں اپنی جنسی تسکین کے لئے اس کے جسم و روح کو کچل کر رکھ دیا۔ کبھی وہ مرد کی عیاشی کا سامان بن گئی تو کبھی عزت وانا اور جہیز و فرسودہ رسم و رواجوں کے شعلوں میں جلا دی گئی۔ زندگی کے ہر مقام پر اسے ذلت و رسوائی، بدنامی اور ایثار و قربانی کے لرزہ خیز حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ اردو ادب کے تقریباً تمام اصناف میں عورتوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ان کے حالات، جذبات و احساسات اور افکار و خیالات کی حقیقی تصویر کشی کی گئی ہے۔ جو آج تک ہمارے ذہن پر گہرے نقوش کی صورت میں باقی ہیں۔ ان تخلیق کاروں نے عورتوں کے دکھ، درد، لاچاری، بے بسی، ان کی سماجی حیثیت اور معاشی بدحالی کو بڑی عمدگی کے اپنی تخلیقات میں پیش کیا۔ ہر دور میں عورت ادب کا موضوع رہی ہے اور ہر زمانے میں اس کے ساتھ ہو رہے ظلم و زیادتی، بربریت اور استحصال کی داستانیں سنائی گئی ہیں۔ عورتوں کی ذلت آمیز زندگی کو بیان کیا اور ان مظلوم، حساس، وسیع النظر اور زمانہ شناس عورتوں کو قوت گویائی عطا کی۔ معاشرے میں اپنی حیثیت اور اپنے وجود منوانے کی تحریک دی۔ ان کے اندر بے چینی و بے بسی اور نفسیاتی الجھنوں کو دور کر کر کے اعتماد دینے کی سعی کی جو ایک طویل عرصے سے مردانہ بالادستی کی گھٹن کو برداشت کر رہی تھیں۔

تقسیم ہند سے قبل جاگیرداروں، زمینداروں، مہاجنوں اور پنڈتوں کی جنسی ہوس اور ظلم و ستم کا نشانہ بنتی رہیں۔ انہیں تعلیم اور علوم و فنون سے محروم رکھا گیا۔ بقول مشتاق احمد وانی:

> ''اس دور جاگیردارانہ ذہنیت اور مطلق العنان روش کے سبب عورت کو اس کی انفرادیت اور بنیادی حقوق سے محروم کر کے اس کو مکمل طور پر مرد سماج نے اپنا تابع و فرماں بردار بننے پر مجبور کر دیا تھا۔ مرد نے اس سلسلے میں سب سے زیادہ کارگر ہتھکنڈہ یہ اپنایا تھا کہ عورت کو تعلیم سے دور رکھنے کی بھرپور کوشش کی کیونکہ مردوں کو اس بات کا خدشہ ستا رہا تھا کہ عورتیں تعلیم یافتہ ہو گئیں تو وہ ان سے اپنے جائز حقوق کا مطالبہ شروع کریں گی۔''(۶)

گویا عورتوں میں رسم و رواج کی پابندی لازمی قرار دی گئی تھی۔ صدیوں پرانی رسمیں سماج میں اتنی گہری ہوتی چلی گئیں کہ عورتوں کا ان سے روگردانی کرنا یا ان کو نہ اپنانا کوئی سہل کام نہ تھا۔ مرد اگرچہ انیسویں صدی کی انقلاب آفریں تبدیلیوں کا اثر قبول کر رہے تھے مگر خواتین کے قلوب سے اس خدشے کو دور کرنا بہت

دشوار تھا کیوں کہ پرانی روایات کے خلاف قدم اٹھانے یا لب کشائی کرنے کی صورت میں پدرسری سماج ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیتا۔

فہمیدہ کبیر ایک جگہ ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں عورتوں کے مثالی کردار کے متعلق یوں رقمطراز ہیں:

> ''نذیر احمد کے ناولوں میں جس مثالی عورت کا تصور ابھرتا ہے وہ دراصل مسلمانوں کے متوسط طبقے سے وابستہ ہے۔انہیں جاگیری دور کی عورت سے شدید ہمدردی ہے جو مردوں کی ملکیت بن کر رہ گئی تھی اور جسے اس لئے جاہل رکھا جاتا تھا کہ مردوں سے مساویانہ حقوق کا مطالبہ نہ کر بیٹھے۔وہ معاشی اعتبار سے مردوں کی دست نگر اور کسمپرسی اور بیچارگی کی زندگی کرنے پر مجبور تھی۔ سماجی زندگی میں اسے کوئی خاص اہمیت حاصل نہ تھی۔نذیر احمد جانتے تھے کہ موجودہ حالات میں جو انگریزی تسلط اور تہذیب کی بنا پر پیدا ہوئے ہیں۔عورت کی بہت سی زنجیریں کاٹنا پڑیں گی تا کہ وہ نئے مسائل سے عہدہ برآ ہو سکے۔عورت کی اصلاح کے معاملے میں نذیر احمد کی نیت پر شک نہیں کیا جا سکتا۔''(۷)

مندرجہ اقتباس کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد نے پہلی مرتبہ اردو ادب میں عورت کی اصلاح اور اس کی حیثیت کی طرف عوام کی توجہ مبذول کروائی۔غرضیکہ ہر دور اور زمانے میں عورتوں کی تباہی و بربادی کو ان حالات کے لئے مناسب اور لازمی قرار دیا گیا۔تقسیم ہند کے جلو میں ہونے والے فسادات میں ان کی روح تک کچل دی گئی۔انسانیت کا وہ ننگا ناچ ناچا گیا کہ آج تک اس کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں۔اس دور میں فسادات کو سب سے اہم موضوع بنایا گیا۔فسادات کی درندگی اور بہیمت نے پوری انسانیت کو ہلا کر رکھ دیا۔فرقہ وارانہ تشدد اور خون ریزی اس وقت کا اہم تقاضہ بن گئی۔ صدیوں پرانی ایثار و قربانی اور روایت کی جگہ خود غرضی، بے اعتباری، نفسانفسی اور کوفزدہ وجودی طرز احساس نے لے لی۔فسادات نے رشتے ناطے، دوستی، وعدے سب بکھیر دئے اور ایک منجمد معاشرہ انقلاب کا شکار ہو گیا۔اس پوری صورتحال میں ادیب و دانشور بھی شریک تھے اور وہ بھی اس مجبور معاشرے کا ایک حصہ تھے۔فنکاروں میں وہ بھی تھے جنہیں ہجرت کا کرب سہنا پڑا۔فرقہ وارانہ فسادات نے سب کو یکساں طور پر ہلا کر رکھ دیا۔بقول انور پاشا:

''ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کے ناول نگاروں نے تقسیم ہند کے جلو میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات اور بہیمیت کے خلاف اپنے قلم کا استعمال کیا۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں فرقہ پرستی کی مذمت اور انسان دوستی کے جذبے کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ناولوں میں افراد کو فرقوں کا نمائندہ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ ظلم اور بربریت سے نفرت پیدا کرنے کے لئے بہیمیت کے شکار کردار اس طور پر پیش کئے گئے کہ قارئین کے دلوں میں فرقہ پرستی کے خلاف جذبات پیدا ہوں یا پھر ایسے کردار پیش کئے گئے جو اس درندگی اور عصبیت کے ماحول میں بھی انسایت کی شمع فروزاں کئے ہوئے تھے۔''(۸)

رامانند ساگر کا ''اور انسان مر گیا'' فسادات کے موضوع پر لکھا گیا انتہائی قابل ذکر ناول ہے۔ ناول کے نمائندہ کرداروں میں آنند، نرملا، رحمٰن، کشن چند وغیرہ شامل ہیں۔ ناول نگار نے ان کرداروں کے ذریعہ فسادات کے دوران وحشیانہ مظالم اور خون ریزی کے ہولناک مناظر دکھائے ہیں۔ ناول میں اچھے برے دونوں قسم کے کردار ہیں۔ ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو فرقہ واریت سے بلند ہو کر انسان کے تحفظ کے لئے اپنی جان دینے سے بھی دریغ نہیں کرتے اور ایسے افراد بھی ہیں جو دوسرے انسانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ دیتے ہیں۔ ناول میں واقعیت اور جذباتیت ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

تقسیم ہند کی المناکیوں کو پیش کرنے میں رامانند ساگر نے جن نسوانی کرداروں سے قصے کا تانا بانا تیار کیا ہے ان میں سب سے اہم اور متحرک کردار نرملا کا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ نرملا کا کردار ''اور انسان مر گیا'' کے جملہ کرداروں میں سب سے زیادہ کامیاب ہے۔ نرملا کا کردار اس امر کا اشارہ ہے کہ سیاسی جغرافیہ پر مبنی دونوں ملک ان مردوں کے تھے جن کی نگاہوں میں عورت کا کوئی مقام نہیں تھا۔ زمینوں کی طرح عورتوں کے جسموں کا بٹوارہ تو انہوں نے کر لیا تھا لیکن مغویہ عورتوں کی واپسی کو قبول کرنا انہیں قطعی گوارہ نہ تھا۔ البتہ عورتوں کو اٹھا لینا ان کے نزدیک وقار اور فخر کی بات تھی۔ نرملا کا کردار اسی سچویشن کی نمائندگی کرتا ہے۔ چنانچہ راوی پار کے مسلمان جب کشتی کے سہارے نرملا کو اٹھانے آتے ہیں تو اس کے شوہر کو اپنے خاندان کی عزت و ناموس کا ذرہ برابر بھی خیال نہیں رہتا ہے اور وہ بیوی کو بچانے کی بجائے اپنی جان بچا کر بھاگ جاتا ہے۔ لیکن یہی نرملا جب شفقت مادری سے مغلوب ہو کر اپنے بیٹے پریم سے ملنے کسی طرح بھاگ اپنے گھر آتی ہے تو بزدلوں کی طرح اپنی بیوی کو چھوڑ کر بھاگ جانے والا اس کا شوہر اپنے خاندان کی نام نہاد

عزت کی دہائی دیتے ہوئے اسے اپنانے سے انکار کر دیتا ہے۔اور نرملا اپنے بیٹے سے ملنے کی تمنا لئے واپس چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اس صدمہ کی تاب نہ لا کر وہ خود کو راوی کے سپرد کر دیتی ہے۔لیکن راوی بھی اسے قبول نہیں کرتی۔ چنانچہ بیہوش حالت میں ایک کیمپ میں نرملا پہنچائی جاتی ہے جہاں اس کی ملاقات آنند سے ہوتی ہے۔ہوش میں آنے کے بعد نرملا اپنی بپتا یوں سناتی ہے:

''میں نے دروازہ کھٹ کھٹایا تو انہوں نے اندر سے ہی آواز دے کر پوچھا کون؟ میں نے جلدی سے کہا میں ہوں نرملا... انہوں نے حیرت کے مارے جلدی سے کہا۔تم....؟ ..... میں نے دروازے زور زور سے تھپتھپانا شروع کر دیا۔دروازہ کھلو، میں ہوں نرملا۔نرملا.....آخر دروازہ کھلا.....لیکن پتہ نہیں انہیں کیا ہو گیا تھا۔انہوں نے اول تو جیسے مجھے پہچانا ہی نہیں۔اور پھر انہوں نے نہایت ٹھنڈی آواز میں کہا کہ اب یہاں کیا کرنے آئی ہو''۔.....اتنے میں میرے سسر کی کھڑاؤں کی آواز آئی وہ ہمیشہ کی طرح وہ رام نام کا پٹکا لپیٹے آنگن میں آئے۔ میں نے آگے بڑھ کر ان کے چرن چھوئے۔لیکن انہوں نے آشیرواد بھی نہیں دیا۔اپنے بیٹے کی طرف ایک بار سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔اور پھر میری طرف اور پھر ان کی زبان سے نکلا.....رام۔ رام۔ جیسے میرے ناپاک لمس سے بچنے کے لئے وہ رام نام کی پناہ ڈھونڈ رہے ہوں''۔.....گھر سے نکالتے ہوئے میرے سسر نے یہ بھی کہا کہ دکھی ہونے کی کوئی بات نہیں۔ہم نے ان سے پورا بدلہ لے لیا ہے۔جتنی عورت وہ ہمارے گاؤں کی اٹھا کر لے گئے ہیں ان سے کہیں زیادہ ہم ان کی عورتیں گاؤں میں لے آئے ہیں.....''اور انہیں آپ نے اپنے گھروں میں بسالیا''؟..... ہاں انہیں اپنے گھر میں رکھنا تو فخر کی بات ہے۔''(۹)

محولۂ بالا اقتباس میں تقسیم ہند کے المیے اور فسادات کے اثرات کی نشاندہی کس نہج سے ہوئی ہے محتاج صراحت نہیں۔اس ناول میں کئی مقام ایسے آئے ہیں جہاں پر فرقہ واریت اور اس کی بربریت کی انتہا کو متعدد دفع محسوس کیا جا سکتا ہے۔ زیر نظر ناول میں اس بات کو عام کیا گیا ہے کہ فسادات کے وقت انسان تہذیب واخلاق کے لبادوں کو تار تار کر کے اپنی اصل حالت میں آ گیا تھا۔ چنانچہ مردوں اور عورتوں کو ننگا کر کے ٹرین کے ڈبوں کے باہر لٹکانا،ان کی چھاتیوں پر پاکستان لکھنا،عورتوں کے باپ، بھائی اور دیگر رشتہ داروں کے سامنے ان کی اجتماعی آبروریزی کرنا،عورتوں کا برہنہ جلوس نکالنا، بچوں کی ٹانگ پر اپنی

ٹانگ رکھ کر دوسری ٹانگ کو ہاتھ سے پکڑ کر چیرنا، کم عمر بچوں کو نیزوں پر لٹکا کر فتح کے جھنڈوں کی مانند اٹھائے رہنا، وغیرہ شیطانی اعمال نہیں تو کیا ہیں! چنانچہ فسادات پر وقار عظیم کا تجزیہ بے حد موزوں ہے کہ:

''انسان کی اصل سرشت حیوانی ہے اور اب تک اس نے اس سرشت اور فطرت پر تہذیب واخلاق کے جو حریری پردے ڈال رکھے تھے انہیں خود ہی تار تار کر ڈالا ہے اور حیوانیت اپنے اصلی روپ میں بے نقاب ہو کر سامنے آ گئی ہے۔''(۱۰)

''اور انسان مر گیا'' کے کرداروں میں نرملا کے علاوہ آنند، اوشا، سیٹھ کشور لال، اجاگر سنگھ،، انتی، مولانا، کشن چند بھی قابل توجہ کردار ہیں۔ آنند ناول کا ہیرو ہے۔ یہ کردار سے آخر تک ناول کے کینوس پر حاوی ہے۔ وہ شاعر ہے اور سیٹھ کشور لال کی لڑکی اوشا سے عشق بھی کرتا ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات کا آغاز ہوتے ہی آنند کا آبائی مکان فساد کی نذر ہو جاتا ہے اور افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ آگ اسی شمس الدین نے لگائی تھی جس کے گھر میں لگی آگ کو بجھانے کے لئے آنند شعلوں کے درمیان کھڑا تھا۔ وہیں دوسری جانب جب سیٹھ کشور لال کا محلّہ فسادیوں کا شکار بنتا ہے تو وہاں کی عورتیں مسلمانوں کے قبضے میں آجاتی ہیں۔ اوشا سمیت تین لڑکیاں مولانا کے حوالے کر دی جاتی ہیں۔ ان تینوں لڑکیوں کو مسلمانوں نے اس وقت تک مولانا کی نگرانی میں رکھا تھا جب تک کہ وہ دیگر مقامات پر فسادات بھڑکانے کا کام انجام دے کر مطمئن نہ ہو جائیں۔ دریں اثنا مولانا کی ملاقات آنند سے ہوتی ہے اور یہ تینوں لڑکیاں ریفیو جی کیمپ پہنچا دی جاتی ہیں۔ جہاں اوشا اپنے باپ کو دیکھتی ہے۔ جو فساد کے وقت رقم کی تھیلی لے کر اپنے گھر کے پچھلے دروازے سے اس طرح بھاگ گیا تھا کہ اپنی جوان بیٹی کے لٹ جانے تک کا خیال نہیں رہا تھا۔ چونکہ اوشا مسلمانوں کے قبضے میں رہی ہے اس لئے اسے ڈر تھا کہ آنند اسے قبول کرے گا یا نہیں۔ اسی خوف و ہراس اور بدگمانی میں وہ زہر کھا کر خودکشی کر لیتی ہے۔ ناول نگار نے اوشا کے توسط سے تقسیم کے المیے کو اجاگر کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی ہے۔ خودکشی سے قبل اوشا آنند سے کہتی ہے:

''کیا تم مجھ سے اس لئے نفرت کرنے لگ گئے کہ مجھے مسلمان اٹھا لے گئے تھے۔''(۱۱)

دراصل فسادات کے وقت بہیمیت اور بربریت کا ایسا شرمناک ماحول تھا کہ مخالف عورتوں اور دو شیزاؤں کی عصمت دری ان کے مردوں اور رشتہ داروں کے سامنے کی جاتی تھی۔ ایسے میں غیرت مند شخص

کے نزدیک عزت وآبرو کو محفوظ رکھنا سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ راما نند ساگر نے فسادات کے اس المیے کو اجاگر سنگھ کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ وہ راولپنڈی کا باشندہ ہے۔ جب اس کے گاؤں پر سرحدی مسلمانوں کا حملہ ہوتو اس نے اپنی بیوی اور دو بچوں کو تلوار سے قتل کر ڈالا اور اس کے بعد مسلمانوں سے مقابلہ کیلئے سینہ سپر ہو گیا۔ قتل کے وقت اس کے بیٹے کا یہ جملہ انتہائی المناک صورت اختیار کر لیتا ہے:

''باپو!.....ماں تو کہتی تھی کہ مسلمان ہمیں مار ڈالیں گے پھر تم کیوں مارتے ہو؟ کیا تم مسلمان ہو گئے۔'' (۱۲)

فسادات کے ماحول نے اجاگر سنگھ کے ذہن کو ماؤف کر دیا اور وہ ''میں بچ گیا.....میں بچ گیا'' کی رٹ لگاتا رہتا ہے۔ فسادات کے المناک واقعات پیش کرنے میں راما نند ساگر ہر مقام پر غیر جانبدار نظر آتے ہیں۔ انہوں نے ہندو، مسلم، سکھ کسی بھی فرقے کی طرف داری نہیں کی۔ انہوں نے ہر قوم و فرقے کے مرد، عورت اور بچے کو یکساں طور پر پیش کیا ہے۔ سبھی پر گزرنے والے اس المناک سانحے کے اثرات کو غیر جانبداری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ایک جگہ راما نند ساگر نے جالندھر میں سرزد ہونے والے مسلم کش واقعات کی بھی بڑے ہی دلسوز انداز میں ترجمانی کی ہے۔ جس میں عورت پر ہونے والے اس المیے کو رقت انگیزی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ اس عہد کی بربریت کی پوری تصویر آنکھوں میں اتر جاتی ہے اور دل و دماغ میں غم وغصہ اور افسوس کی لہر نمودار ہو جاتی ہے:

''جالندھر کے ایک ڈاکٹر کی لڑکی.....نے اپنی چھوٹی بہن اور باپ کے ساتھ بیس گھنٹے تک ہندو سکھوں کے ایک بپھرے ہوئے ہجوم کا مقابلہ کیا۔ بیس گھنٹے وہ تینوں ایک ریوالور اور دو رائفلوں سے لڑتے رہے۔ لیکن آخر کار انہیں ہتھیار ڈال دینے پڑے۔ ڈالٹر کو باہر لایا گیا تو ایک جوان گبرو آگے بڑھا.....اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے ایک بوجھل کھانڈے کا ایک بھرپور ہاتھ ایسا مارا کہ کھانڈا ڈاکٹر کی کھوپڑی کو چیر کر چھاتی کے ایک طرف سے ہوتا ہوا ایک کولھے کے قریب سے نکل گیا.....اس کے بعد ان دونوں لڑکیوں کو باہر لا کر انہیں کہا گیا کہ ''جے ہند'' کا نعرہ لگائیں۔ لیکن انہوں نے انکار کر دیا.....آ کر میں کسی نے گریبان میں ہاتھ ڈال کر ان کے کپڑے بالکل چیر دیئے۔ اور وہ دونوں بالکل عریاں کر دی گئیں.....ایک نوجوان نے طیش میں آ کر اپنی تلوار کی نوک اس کی شرمگاہ میں اس طرح ٹھونس دی کہ وہ چیرتی ہوئی لڑکی پیٹ تل آ

گئی۔اسی وقت چھوٹی بہن کو ایک اور نے سڑک پر لٹا لیا اور کھلے عام کئی بہادروں نے وہیں داد عشرت دی۔''(۱۳)

''اور انسان مر گیا'' میں ہندو مسلم فساد اور ان فسادات میں عورتوں پر ہو رہے ظلم و زیادتی کو بڑے ہی فنکارانہ اور حقیقی پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔

فرقہ واریت کے فروغ میں نہ صرف سیاسی لیڈروں کا ہاتھ تھا بلکہ پولیس کے ذریعہ ایک مخصوص طبقے کی جماعت سے بھی فرقہ واریت کی راہ ہموار ہوئی ہے۔ ہندوستانی پولیس کی عصبیت اور تنگ نظری نے قومی خیر سگالی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی عمارت کو جلا کر خاکستر کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی ہے۔ چنانچہ اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ فسادات کے موقع پر پولیس عملوں کا موجود نہیں رہنا مناسب ہے۔ کیونکہ پولیس کی عدم موجودگی میں کھلا ذہن رکھنے والے افراد کا دل قابل ستائش ہو سکتا ہے۔ اور ان کی مخلصانہ کوششوں سے فسادات فرو ہو سکتے ہیں۔اس حقیقت کی نقاب کشائی میں عبدالصمد نے بڑی جرأت مندی سے کام لیا ہے۔ اتنا ہی نہیں ناول نگار نے اس نکتے کی بھی وضاحت کی ہے پولیس کی بربریت کے سیاسی جماعتیں بے حس و حرکت ہو جاتی ہیں۔اس سلسلے کا ایک اقتباس دیکھئے جس میں انور اپنے والد سے کہتا ہے کہ:

'' آپ کو پتہ ہے ابا کہ اب ہندوستان میں ہندو مسلم فساد نہیں ہوتے بلکہ پولیس کے ذریعہ باقاعدہ قتل عام کیا جاتا ہے۔ چندیری کا واقعہ تو ابھی تازہ ہے جہاں درجنوں معصوم لوگ، عورتیں، بچے پولیس کے ذریعہ ذبح کر دیئے گئے۔ پھر بھی ہمارے ملک میں کسی کا ذمیر بیدار نہیں ہوا۔ کسی کی سوئی ہوئی آتما نہیں جاگی۔ کوئی بابا آمتے امن مشن لے کر نہیں آیا۔ کوئی نرملا دیش پانڈے نے اس کے خلاف پدیاترا نہیں کی۔''(۱۴)

فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ ہندوستان کی آزادی سے قبل شروع ہوا اور ہنوز جاری ہے۔ فسادات کے روپ میں اس بھیانک ناسور نے اقلیتی طبقے کے لوگوں کا چین کی سانس لینا دوبھر کر دیا۔ ''دوگز زمین'' تقسیم ہند کے المیے کے موضوع پر ایک مقبول ناول ہے۔ یہ ناول اپنے دائرے میں تحریک آزادی، سیاسی جماعتوں کی کشمکش سے پیدا شدہ فرقہ وارانہ فسادات، ہندوستان کی تقسیم اور آزادی، قیام پاکستان، مشرقی

پاکستان میں مہاجروں اور وہاں کے قدیم باشندوں کا تہذیبی ٹکراؤ، زبان کی بنیاد پر پاکستان کا بٹوارہ، ہندوستانی سیاست کی ابتری اور زمیندارانہ نظام کا زوال جیسے ضمنی موضوع کو سمیٹے ہوئے ہے۔ ناول نگار نے ایک ایک ہی کنبے کی حویلی کو دونوں جماعتوں کا گہوارہ قرار دیا ہے۔ ناول میں یہ حویلی متحدہ ہندوستان کی علامت کے طور پر نمودار ہوئی ہے۔ یہ حویلی جو ''بین ہاؤس'' کے نام سے جانی جاتی ہے اس میں شیخ الطاف حسین اور ان کی فیملی رہتی ہے۔ اختر حسین اور اصغر حسین شیخ صاحب کے بالترتیب داماد اور بیٹے ہیں۔ شیخ صاحب کٹر کانگریسی تھے۔ اور ان کے ماموں متشدد مسلم لیگی۔ دونوں کے درمیان سیاسی نظریات کی بنا پر کشیدگی تھی۔ شیخ الطاف حسین کی وفات کے بعد ان کے داماد اختر حسین ان کی سیاسی وارث بنے۔ جب کہ ان کے بیٹے اصغر حسین مسلم لیگ کے حامی رہتے ہیں۔ اس طرح ''بین ہاؤس'' ایک سیاسی مکتبۂ فکر ہے جس میں:

> ''گھر کی عورتیں ایک طرف مسلم لیگی کارکنوں کے لئے دیگیں چڑھاتیں تو دوسری طرف کانگریس کارکنوں کے لئے پرہیز غذائیں تیار کراتیں۔''(۱۵)

عبدالصمد نے فرقہ وارانہ فسادات کے محرکات کی نشاندہی کرتے ہوئے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہندوستان میں اعلیٰ طبقہ اونچی ذات کے لوگ کس طرح سے نچلے طبقے کے لوگوں سے فسادات کی فضا سازگار کرواتے ہیں۔ قیام پاکستان کے زیر اثر فرقہ واریت کا زبردست بھونچال ظہور میں آیا اور ملک دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔ اس کے علاوہ قیام بنگلہ دیش نے عوام میں مزید افراط تفری کا ماحول برپا کر دیا۔ قیام بنگلہ دیش نے مولانا ابوالکلام آزاد کی اس پیشن گوئی کو حقیقت کا جامہ پہنا دیا کہ:

> ''آپ مادر وطن چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ آپ نے سوچا اس کا انجام کیا ہوگا؟ آپ کے اس طرح فرار ہوتے رہنے سے ہندوستان میں بسنے والے مسلمان کمزور ہو جائیں گے اور ایک وقت ایسا بھی آ سکتا ہے کہ جب پاکستان کے علاقائی باشندے اپنی اپنی جداگانہ حیثیتوں کا دعویٰ لے کر اٹھ کھڑے ہوں۔ بنگالی، پنجابی، سندھی ، بلوچ اور پٹھان خود کو مستقل قومیں قرار دینے لگیں۔''(۱۶)

چند ہی برسوں کے بعد پاکستان میں خانہ جنگی شروع ہو جاتی ہے اور پاکستان کے تقسیم کے نتیجے میں

بنگلہ دیش کا وجود عمل میں آ جاتا ہے۔ جہاں سے بہاریوں اور پاکستانیوں کو کھدیڑ کر یا مار کاٹ کر باہر نکالا جا رہا ہے۔ اسی اثناء میں دوبارہ دنگا فساد کا خونی بازار گرم ہو جاتا ہے۔ گھروں، کوٹھریوں اور دکانوں سے ان لوگوں کو کھینچ کر نکالنے کا دور شروع ہوتا ہے۔ جس کے عتاب کا نشانہ عورتیں، مرد، بچے اور بوڑھے بنتے ہیں۔ سبھی مردوں اور عورتوں کو علیحدہ کوٹھری میں ٹھونس دیا جاتا ہے۔ اور باری باری سے انہیں باہر نکال کر گولی ماردی جاتی ہے۔ وہیں عورتوں میں کنواری اور نوجواں لڑکیوں کو چن کر ان کے ساتھ زیادتی اور عصمت دری کی جاتی ہے۔ اس ہیبت ناک منظر کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''وہ ایک بہت بڑا احاطہ تھا۔ جیسا بڑے زمینداروں اور کاشتکاروں کے ہاں بیل، بھینس اور گائے باندھنے کے لئے گوشالہ ہوا کرتا تھا۔ اس میں سینکڑوں افراد تھے، عورتیں، مرد اور بچے۔ وہ سب کے سب گوشالہ میں بندھے جانور تھے، مرد مرد میلے، کچیلے، داڑھیاں بڑھی ہوئی، بال الجھے ہوئے، عورتوں کے جسم خشک اور کپڑے چیتھڑے، چہروں پر خوف وحشت کے سائے۔ نوجوان لڑکیوں کو الگ باندھ رکھا گیا تھا۔

انہوں نے سبھی قیدیوں کو نعرہ لگانے کو کہا۔

''جے بنگلہ دیش۔''

قیدیوں نے بہت جوش وخروش کے ساتھ نعرہ لگایا اور اس وقت تک لگاتے رہے جب تلکہ ان کے گلے بیٹھ نہیں گئے..... جو لوگ انہیں یہاں لائے تھے وہ بہت اطمینان سے ان کی حالت پر ہنستے رہے۔''(۱۷)

دہشت گردی کی سفاکیت اور حیوانیت کی ایک اور مثال دیکھیں:

''روز رات میں یہی قصہ دوہرایا جاتا کہ چن چن کر لوگ لے جاتے اور ان سے نعرہ لگوا کر گولی مار دی جاتی۔ دن میں بھی کچھ لوگ آتے، وہ لڑکیوں کو چنتے۔ اس کے بدلے میں وہ فوجیوں کو ہتھیار، کپڑے اور کھانے کی اشیاء دے جاتے۔ حامد کسی نہ کسی طرح چھپ چھپا کر جاتی ہوئی لڑکیوں کو دیکھ لیتا اور ان میں نازیہ کو نہ دیکھ کر خدا کا شکر بجالاتا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ بکرے کی ماں زیادہ دیر تک خیر نہیں منا سکتی۔''(۱۸)

بنگلہ دیش کا ظہور اور اس کے نتائج میں ہونے والی فرقہ واریت میں پولیس اہلکار اور فوجی بھی فرقہ

پرستوں میں شامل تھی۔ وہ دور ایسے حیوانیت کا دور تھا کہ اپنا بھی پرایا ہو گیا۔ روز محشر کا ماحول برپا تھا۔ جہاں سبھی کو صرف اپنی ذات مطلوب تھی۔ نہ رشتوں کا احساس نہ ہی عزت وحرمت کا پاس۔ فساد کے دوران عورتوں پر ہوئے ظلم وستم کی کہانی اور ان کی زبوں حالی کا منظر ناول میں بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ایک مقام پر جب فوجیوں نے حامد کو نازیہ اور بچوں کو پہچان کر باہر لانے کا حکم صادر کیا اس وقت اندر کا منظر دیکھ حامد جامد وساکت رہ گیا۔ ملاحظہ فرمائیں:

''حامد کو دو آدمی عورتوں کے حصہّ میں لے گئے۔ وہاں کی حالت دیکھ کر حامد کانپ اٹھا۔ عورتوں کی تعداد بہت کم رہ گئی تھی۔ زیادہ تر نوجوان اور کنواری لڑکیاں وہاں سے لے جائی جا چکی تھیں۔ باقی انتظار میں تھیں اور بہت ہی بری حالت میں۔ اس نے نازیہ کو ایک ہی نظر میں دیکھ لیا، یہ حامد ہی کی نگاہ تھی جس نے اسے پہچان لیا ورنہ نازیہ ہرگز نہ تھی.....وہ تو ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئی تھی۔ میلے کچیلے گندے کپڑے، بال خشک اور الجھے ہوئے اور آنکھیں، سیاہ کٹوریوں میں پڑی بے جان سی، نجانے کس طرف کو دیکھتی ہوئی۔''(۱۹)

''زمین'' بھی فرقہ وارانہ فسادات کے موضوع پر لکھا گیا ایک اہم اور قابل ذکر ناول ہے۔ جس میں قیام پاکستان اور فسادات کے علاوہ مہاجرین کے مسائل کا بھی تجزیہ کیا گیا ہے۔ ناول کا آغاز پاکستان میں مہاجرین کیمپ سے ہوتا ہے جہاں ایک بڈھا اپنی بیٹی کے لئے کراہ رہا ہے۔ اس کی بیٹی ہندوستان سے آتے ہوئے اغوا کر لی گئی تھی۔ جس کی کوئی خبر نہیں مل پا رہی تھی کہ وہ زندہ بھی ہے یا انسانی بھیڑئے نے نوچ کھسوٹ کر پھینک دیا۔ کیمپ میں مہاجرین خوش تھے کہ وہ اپنے ملک پاکستان بحفاظت پہنچ گئے۔ لیکن بڈھا اپنی بیٹی کے لئے مسلسل چیخ رہا تھا۔ لوگوں نے اسے پاگل قرار دے کر پاگل خانے میں بند کروا دیا۔ اس کی دلخراش چیخیں اور برستی آنکھیں صرف اپنی بیٹی کو دیکھنا اور بلانا چاہ رہی تھیں جو ایسے اندھیرے میں گم ہو گئی تھی جہاں سے کوئی واپس نہ آ سکا۔ اس کی نوحہ خوانی دل ودماغ کو جھنجھوڑ دیتی ہے۔ کیمپ میں موجود ساجدہ مسلسل اس بوڑھے کی چیخ وپکار سن رہی ہے اور وہاں موجود لوگوں کے بے حس روّیے کو بھی دیکھتی ہے۔ وہ بوڑھے سے پوچھتی ہے:

''بابا! تم کس بیٹی کو پکار رہے ہو؟ وہ بیٹی نہیں تھی بابا! وہ لوٹ کا سب سے قیمتی مال تھی، وہ تمہارے چیخنے سے واپس نہیں آئے گی۔ تمہاری آواز اس تک نہیں پہنچ سکتی۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔

بوڑھا پھر چیخا، وہ میری بیٹی تھی۔ وہ مال خزانہ نہیں تھی..... بابا! تمہاری بیٹی کے اغوا کا بدلہ چک گیا ہے۔ وہاں بھی بہت سے باپ تمہاری طرح رو رہے ہوں گے۔ لوٹ کا مال واپس بھی مل جائے تو پورا نہیں ہوتا۔'' (۲۰)

مندرجہ بالا اقتباس سے ساجدہ کے غم و غصے کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ جو اس وقت ہونے والے واقعات وحادثات کا ردعمل تھا۔ یاس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان فسادات میں اگر سب سے زیادہ کوئی متاثر ہوا ہے، جنہیں اپنی بقاو بدلے کا آلہ کار سمجھا گیا اور جس کی ذات کو تقسیم کے لئے خراج کے طور پر استعمال کیا گیا وہ عورت تھی۔ ایک ملک میں عورت پر کئے گئے ظلم وزیادتی کا بدلہ دوسرے ملک کی معصوم و بے گناہ عورتوں کے ساتھ یکساں سلوک کر کے لیا جاتا تھا۔ اس طرح کے بیشتر واقعات وحادثات کا ذکر متعدد ناول نگاروں نے اپنے ناولوں میں کیا ہے۔ جن سے اس وقت میں عورتوں کی اصل صورتحال سامنے آجاتی ہیں۔

کرشن چندر کا ناول ''غدّار'' اس حقیقت کی آئینہ داری کرتا ہے۔ جو اس عظیم سانحے کے نتائج میں مردوں بالخصوص عورتوں کو جھیلنی پڑی۔ اس ناول میں ہجرت کے دوران قتل وغارت گری کے مناظر کو پیش کیا گیا ہے۔ کہانی کی ابتدا ۲۱/اگست ۱۹۴۷ء سے ہوتی ہے۔ پاکستان کا مطالبہ تسلیم کرلیا گیا تھا۔ ملک تقسیم ہوکر آزاد ہونے والا تھا۔ تقسیم کے مطالبے کے ردعمل میں پورے ملک میں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے تھے۔ لیکن پنجاب کے لالہ پور گاؤں میں فساد کی لہر ابھی تک نہیں پہنچی تھی۔ گاؤں میں سب سے زیادہ آبادی برہمنوں کی تھی اور سب سے کم مسلمان تھے۔ آپس کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ ناول کی ابتدا میں ہی ایک ہندو لڑکے کو مسلم لڑکی سے عشق کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ لیکن اس محبت میں ایسی جدائی ہونے والی تھی جو ناقابل برداشت تھی۔ جس کا ان دونوں کو احساس نہیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے وعدہ کر رہے تھے۔ تقسیم ہند کے زیر اثر جب برصغیر میں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہوئے تو علی پور سیداں کے سرغنہ پیر قلندر شاہ نے نمبردار سربلند کو اطلاع دی کہ پندرہ اگست تک گاؤں میں جتنے ہندو نوجوان ہیں ان کو قتل کروا دے۔ جوان عورتوں کو جو اس گاؤں کے علاوہ آس پاس کے گاؤں سے آکر جمع ہوئی ہیں ان سب کو رکھ لے اگر وہ ایسا نہیں کرتا ہے تو پھر علی پور سیداں یہ کام پورا کریں گے۔ لیکن سربلند نے ایسا کرنے سے انکار کیا اور محلے کے دہشت زدہ ہندوؤں کو مختلف نوعیّتوں سے ڈھارس بندھائیں۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد بڑے

پیمانے پر ہجرت کا سلسلہ شروع ہوا۔ پورے ملک میں خون خرابا ہو رہا تھا پاکستانی علاقے کے ہندو ہندوستان آ رہے تھے اور ہندوستان کے مسلمان پاکستان جا رہے تھے۔ ان مہاجروں کے لئے پل پل صراط سے کم نہ تھا۔ ناول میں انسانیت کے نہایت شرمناک واقعے بیان کئے گئے ہیں۔ ایک ہی گاؤں کے لوگ آپس میں مار کاٹ کر رہے تھے جن کو کل تک بہن بیٹیاں مانتے تھے انہیں کی عزت لوٹ رہے تھے۔

ایک اقتباس دیکھیں جب ایک جگہ بھیڑ لگی ہوئی تھی جہاں پنڈت جا کر پوچھتا ہے کیا یہاں راشن بکتا ہے تو بدلے میں اسے یہ جواب موصولہا تا ہے جو بہت ہی شرمناک ہے:

''ہاں میاں _____ سیکس کا راشن ملتا ہے۔

.....ایک مسلم لڑکی ہتھے چڑھی ہے ہم لوگ اس کی بے عزتی کر رہے ہیں۔ لائن میں پچیس آدمی تھے پنڈت بھی اس کیو میں شامل ہو گیا اور اگلے آدمی سے پوچھا۔'' یہ کیو کب تک رہے گا۔''

''جب تک وہ لڑکی مر نہیں جاتی۔''

.....اس لڑکی کی چیخیں بڑی دل خراش تھیں کھڑے کھڑے میرے دل کو کچھ ہونے لگا جیسے کوئی میرے دل کو مٹھی میں لے کر دھیرے دھیرے مسل رہا ہو اس لڑکی کی چیخیں بڑی دردناک تھیں۔''(۲۱)

انسان کے مقابلے میں حیوان جو بالکل ناسمجھ ہوتے ہیں ان میں بھی ایسی درندگی اور وحشیانہ پن نہیں ہوتا۔ ناول نگار نے انسان کے کردار کو کتے سے بھی زیادہ حقیر بتایا ہے۔ لڑکی کی چیخ و پکار کی تاب نہ لا کر بیج ناتھ کیو سے نکل جاتا ہے۔ دریں اثنا لاشوں کے میدان میں ایک مسلم بچے کو بلکتا ہوا دیکھ کر اس کے میلان میں توزن پیدا ہو جاتا ہے اور انتقام کی آگ جو اس کی بہن سروج کو اغوا ہونے اور خاندان کے بچھڑ جانے پر مسلمانوں کے لگی ہوئی تھی وہ بجھ گئی۔ ناول ''غدّار'' کا خاتمہ اسی بچے کے متعلق بیج ناتھ کے تصورات پر ہوتا ہے۔

ناول میں تقسیم ہند کے المیے کے اثرات کی مختلف نوعیتیں موجود ہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات کے دوران ایک قوم کے بلوائی دوسری قوم پر حملہ کرنے میں مختلف حربوں کا استعمال کرتے تھے۔ بعض واقعات تو ایسے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ مفسدوں پر قتل و غارت کا خبط سوار تھا۔ ان کے ناپاک ارادے کو کسی بھی

صورت میں ان کے دل سے نکالا نہیں جا سکتا تھا۔ اوروں کی اس سلسلے میں مداخلت تو دور خود ان کی شریک حیات کے مشورے بھی ان کے لئے قابل قبول نہیں ہوتے۔ یہ کیفیت کتنی افسوس ناک ہے مندرجہ ذیل عبارت میں خصوصی توجہ کی طالبہے۔ ایک کراہتی ہوئی عورت بیچ ناتھ سے اپنی بپتا سنا رہی ہے:

''جب قافلے پر حملہ ہوا تو مرا گھر والا مجھے چھوڑ کر حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کے لئے جانے لگا تو میں نے اس کی بانہہ پکڑ لی اور اس سے رو رو کر کہا۔ تو جا رہا ہے، کہاں جا رہا ہے؟ مجھے اور میرے بچوں کو چھوڑ کر کس کے آسرے پر جا رہا ہے۔ اس پر میرے گھر والے نے غصے سے میری طرف دیکھا اور چھری سے میرے تینوں بچوں کو ہلاک کر دیا۔ میں ڈر کے مارے بھاگی۔ اس نے زور سے چھری میری طرف پھینکی جو میری کمر میں جا لگی۔'' (۲۲)

بعض لوگ ایسے تھے جن کی ذہنیت مادہ پرستانہ تھی۔ وہ لاشوں کے انبار سے شادمانی کا اظہار کرتے تھے کیونکہ ان لاشوں سے انہیں مال ومتاع دستیاب ہونے کی توقع وابستہ تھی۔ غرض کہ انسان اپنی سطح سے گر کر بے حسی و بے غیرتی اور بے شرمی کا لبادہ اوڑھ لیا تھا۔ ملک کے اعلان آزادی سے کچھ پیشتر فرقہ وارانہ فسادات کے رونما ہونے میں ۱۶/اگست ۱۹۴۶ء کو مسلم لیگ کے رہنما محمد علی جناح کی ہدایت پر منائے جانے والے ''یوم راست اقدام'' (Direct Action Day) کو ذمہ قرار دیا جاتا ہے۔ حیات اللہ انصاری نے بھی ''لہو کے پھول'' میں اس پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے فسادات کی ہولناکیوں کا نقشہ جس نہج سے کھینچا ہے وہ قابل ذکر ہے۔ لکھتے ہیں:

''ایک طرف ہندو گنڈے اپنے کام میں لگے تھے اور مسلمانوں کو مار رہے تھے اور لوٹ رہے تھے اور دوسری طرف مسلمان گنڈے ہندوؤں کے ساتھ وہی برتاؤ کر رہے تھے۔ عورتوں کو سڑک پر لا کر برہنہ کیا جاتا تھا اور پھر اسے کوئی گنڈا اِدھر اُدھر لے جاتا تھا۔ عورتیں جو اس کے ہاتھ آ جاتی تھیں وہ ایسی ادھ مری ہو جاتی تھیں کہ نہ چیخ سکتی تھیں اور نہ بھاگ سکتی تھیں۔ مسلمان گنڈے اور ہندو گنڈے ان دونوں میں وجود باہمی کے اصول پر سمجھوتا سا معلوم ہوتا تھا۔'' (۲۳)

''لہو کے پھول'' میں حیات اللہ انصاری نے ماجرے کی ابتدا جس عہد سے کی ہے وہ خاص طور سے ہندو مسلم کشیدگی اور فرقہ وارانہ منافرت کی ترویج وترقی کا زمانہ ہے۔ وائسرائے لارڈ کرزن نے شعوری طور پر ہندو اور مسلمان کی صدیوں پرانی باہمی رواداری اور اتحاد میں خلیج پیدا کرنے کی غرض سے ۱۹۰۵ء میں صوبۂ

بنگال کی تقسیم کی تھی۔ اگر چہ ملک گیر احتجاج کی وجہ سے ۱۹۱۱ء کے دوبارہ دہلی میں جارج پنجم نے تقسیم بنگال کی تنسیخ کا اعلان کیا تھا اور اسی کے ساتھ دارالسلطنت کلکتہ سے دہلی منتقل کر کے بنگالیوں کی سرزنش بھی کی تھی۔ لیکن یہ اس تفریق کا بیج تھا جو آگے چل کر تصور پاکستان کا تناور درخت بن کر ابھرا۔ کیونکہ بنگال کی تقسیم کے منسوخ ہونے سے قبل مسلم لیگ اور ہندو مہا سبھا جیسی تنظیمیں معرض وجود میں آ چکی تھیں۔ مشرقی بنگال کے میمن سنگھ اور کومیلا میں فرقہ وارانہ فسادات ہو چکے تھے فرقہ واریت کی انسان سوز لہر ملک گیر سطح پر پھیل چکی تھی۔ اگر چہ مسلم لیگ کے ''Direct Action Day'' کے سبب کلکتہ میں فرقہ واریت کا شعلہ بھڑکا۔ تاہم یہ مصدقہ امر ہے کہ فرقہ واریت کی فضا سازگار ہونے میں کانگریس کا لائحہ عمل بھی کوئی کم ذمہ دار نہیں۔ بطور نمونہ ایک اقتباس دیکھیں جس میں مسلم فرقہ کی خواتین محو گفتگو ہیں:

> ''اب کیا بتاؤں کیا حال ہے ہم لوگوں کا، اس سے اچھا تھا کہ یہ ستانے والے ایک دن ہم سبھوں کو اسی طرح مار ڈالتے جس طرح اور جگہ کر رہے ہیں۔ پھوپھی رونے لگیں۔ لڑکیوں کی آنکھیں بھی ڈبڈبا آئیں۔ پھوپھو رو رو اور آنچل سے آنس پونچھ پونچھ بہت درد بھی آواز سے کہنے لگیں.... ہول کے مارے ہم لوگوں کو نہ رات میں نیند آتی ہے اور دن کو چین ملتا تھا۔ ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے کہ دیکھا چاہئے کیا ہوتا ہے..... یہ کم بخت عورتوں کے ساتھ جو سلوک کرتے تھے وہ ہم سب جانتے ہیں۔ میں تو کہتی ہوں ان سب سے کہ بیبیوں! ہم چاہئے کہ ادھر حملہ ہو اور ادھر سب کنویں میں پھاند پڑیں۔ یہ موت حرام نہ ہوگی شہادت ہوگی۔'' (۲۴)

تقسیم ہند کے موضوع پر ''ایوان غزل'' ایک مشہور و مقبول ناول ہے۔ جس میں جیلانی بانو نے سقوط حیدرآباد کے تناظر میں تو سیم ہند کے اندوہناک المیے کو پیش کیا ہے۔ ناول کا آغاز گاندھی جی کی سول نافرمانی تحریک سے ہوا ہے اور تقسیم ملک و آزادئ ہند کے زیر اثر فسادات سے پیدا شدہ ہجرت کی المناکیوں پر ختم ہوا ہے۔ حیدرآباد جو ایک خود مختار ریاست تھی آزدی کے بعد آئین ہند کے وفاقی نظام کے تحت اس ریاست کا سقوط عمل میں آجاتا ہے۔ اس اعتبار اس ناول کی ٹریجڈی سقوط حیدرآباد سے متعلق ہے۔ ناول کے کینوس میں احمد حسین اور واحد حسین کی جاگیرداری کے حالات اور ان کے زوال کی کیفیات کو پیش کیا گیا ہے۔ ان دونوں بھائیوں کی عیش کوشی اپنے وقت کے کسی بھی جاگیردار سے کم نہیں ہے۔ طرب و نشاط کا ماحول وراثت میں ملا ہے۔ وہیں غزل واحد حسین کی نواسی، ہمایوں کی بیٹی اور مسکین علی شاہ طوطا چشمی کی پوتی ہے۔

ناول ''ایوان غزل'' میں جیلانی بانو نے آزادی سے قبل بلکہ انگریزوں کی آمد سے قبل ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کا جائزہ ہندو مسلم قوموں کے باہمی اتحاد و اتفاق کے کے تناظر میں لیا ہے۔لیکن تہذیب کی یہ مشترکہ صورت ہمیشہ کے لئے برقرار نہ رہ سکی۔تحیک آزادی کے اواخر میں ہندو مسلم کے درمیان فرقہ وارانہ منافرت ابھری اور دوقومی نظریے کی نشو ونما ہونے لگی۔اس وقت تک حیدرآباد اس سیاسی اتھل پتھل سے بے نیاز رہا۔ناول نگار نے اس کا اظہار یوں کیا ہے:

> ''یہ وہ زمانہ تھا جب کرپس کی تجاویز کانگیس نے رد کردی تھی اور جناح کے پیچھے مسلمان چلاتے پھر رہے تھے۔''لے کر رہیں گے پاکستان'' پل ٹوٹ رہے تھے۔ریلایں لڑھک رہی تھیں۔ ہندوستان کے تمام اہم لوگوں نے ''سر'' کے خطاب واپس کردئے تھے۔لیکن حضور نظام کو ان کی خبروں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔''(۲۵)

بالآخر فرقہ واریت نے صدیوں پرانی رواداری، اخوت اور قومی سالمیت کو اپنی زد میں لے ہی لیا۔ ہندو مسلم ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن گئے اور فرقہ وارانہ فسادات کی انتہا نہ رہی۔لوگوں نے وحشیانہ وظالمانہ طرز عمل سے گریز نہ کیا اور ایک دوسرے پر پل پڑے۔جیلانی بانو نے اس افسوس ناک سانحہ کو یوں پیش کیا ہے:

> ''ہر گھر سے چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔عورتیں اپنی چھتوں پر کھڑی ننھے سپاہیوں کو پکار رہی تھیں جو بندوقیں تھامنا نہیں جانتے تھے مگر چند مفاد پرستوں نے ان کے ہاتھ میں جذبات کی لاٹھی تھمادی تھی۔ہزاروں نوجوانوں کی لاشیں پیڑوں میں الجھی ہوئی تھیں۔چٹانوں پر بکھری پڑی تھیں۔ ندیوں میں تیر رہی تھیں۔ان کی کھلی ہوئی ساکت آنکھیں پوچھ رہی تھیں۔ہم کس کے لئے لڑے۔''(۲۶)

''اداس نسلیں'' میں فرقہ وارانہ بربریت اور سفاکیت کا اندازہ اس اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے:

> ''گرجتی ہوئی ایک گاڑی پلیٹ فارم پر آکر رکی.....مگر اس گاڑی سے کوئی نہ اترا کیونکہ وہ شمال کی طرف سے بھری ہوئی آئی تھی اور ہندوستان جارہی تھی.....گاڑی کے دروازے اور کھڑکیاں بند تھے اور چند ایک کھلی کھڑکیوں میں سے بچوں کے ایسے زرد اور خوف زدہ چہرے نظر آرہے تھے.....پھر ایک شور اٹھا اور واویلا کرتے ہوئے لوگوں کا چھوٹا سا ہجوم اسٹیشن میں داخل ہوا۔

سامنے آتے ہی ان بظاہر غیر مسلح لوگوں میں سے ایک نے جیب سے پستول نکال کر ہوا میں دو فائر کئے۔ دوسرے نے اس کے ہاتھوں سے پستول چھین کر کھڑکی کے شیشے سے منہ لگا کر باہر دیکھتے ہوئے ایک زردرو بچے کا نشانہ لیا..... پھر پلیٹ فارم سے تمام مردہ اور نیم مردہ لوگ حیرت انگیز جوش اور پھرتی کے ساتھ ساتھ گاڑی پر ٹوٹ پڑے۔ دروازہ اور کھڑکیوں کے ٹوٹنے کی آواز اکا دکا ہوتے ہوئے فیئروں کے خشک پٹاخے دار آواز سے رل مل گئی۔ ایک عورت کی آواز تھی۔ ظالم، قاتل میرے خاوند کو میرے بچے کو مار دیا۔ مجھے بھی مار دو، مجھے کیوں چھوڑ دیا؟ عورت بولتے بولتے رک گئی۔ پھر وہ ایک دم پیچھے ہٹی اور وقت ضائع کئے بغیر دونوں سے پکڑ کر چھاتی پر سے اپنا ململ کا کرتا دامن تک پھاڑ ڈالا۔'' (۲۷)

غرض کہ ۱۹۴۷ء فسادات میں معاشرے کے ہر فرد کو مختلف نقصانات کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ نقصان جانی و مالی اور روحانی ہر طرح کے تھے۔ ان نقصانات نے کئی اور نقصانات و نفسیاتی مسائل کو جنم دیا۔ لیکن یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو ملنے والی آزادی کی سب سے بھاری قیمت خواتین نے اپنی عزت قربان کر کے ادا کی۔

ہمارا معاشرہ مردوں کا معاشرہ ہے۔ لہٰذا اس معاشرے کی عورت ہمیشہ سے مرد کے ظلم و ستم کا نشانہ بنتی رہی ہے۔ عورت کا تعلق چاہے کسی بھی طبقے سے ہو مرد نے ہمیشہ عورت پر اپنی حاکمیت جتائی ہے، اور اسے اپنے مفاد کے لئے استعمال کیا ہے۔ جب ۱۹۴۷ء کے فسادات شروع ہوئے تو ان قیامت خیز حالات اور افراتفری کی بیش تر مردوں نے سنہرا موقع جانتے ہوئے محض اپنی تفریح اور جنسی تسکین کے لئے عورت کو جنسی تشدد کا نشانہ بنایا، انہیں اغوا کیا اور قحبہ خانوں کی زینت بنایا۔ اس کے علاوہ بیش تر عورتوں کی تجارت بھی کی گئی۔ بہت سی خواتین ایسی بھی تھیں جنہوں نے مردوں کی ہوس کا نشانہ بننے سے پہلے خودکشی کر لی۔ جو خواتین اغوا کر لی گئیں یا مردوں کی تفریح طبع کا ذریعہ بنیں۔ وہ نہ صرف کئی نفسیاتی مسائل کا شکار ہوئیں، بلکہ ان کی سماجی حیثیت بھی خاک میں مل گئی۔ یہاں تک کہ ان کے گھر والوں نے بھی انہیں قبول نہ کیا۔ اس وجہ سے بہت سی خواتین نے ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ زندگی گزارنے کو ہی ترجیح دی۔

اس حقیقت سے بھی نہیں کیا جا سکتا ہے کہ جن مردوں نے خواتین کے ساتھ زیادتی کی وہ سب درندہ صفت انسان نہ تھے، بلکہ بعض مرد ایسے بھی تھے جنہوں نے اپنی عورتوں کی بے حرمتی کا بدلہ لینے کے لئے

تمام اخلاقی قدروں کو بالائے طاق رکھ کر دوسروں کی عورتوں کی ءبے حرمتی کرنا پڑی۔ایسے مرد بھی کئی نفسیاتی مسائل کا شکار ہوئے اوران کے اس فعل پران کا ضمیر ساری زندگی لامت کرتا رہا۔

الغرض تقسیم ہند اور اس کے نتیجے میں ہونے والی قتل وغارت کے موضوع پر متعدد کتابیں تحریر ہوئیں ہیں جن کے مطالعے سے ہمیں اس عظیم بٹوارے کے سیاسی، سماجی وتہذیبی پس منظر سے اگاہی ہوتی ہے۔ ۴۷ء کے فسادات برصغیر کی تاریخ کا ایک بدترین باب ہیں۔جنہیں دیکھ کر ہندوستانی ادیبوں اور دانشوروں نے اپنے اپنے انداز میں غم واندوہ کا اظہار کیا۔شاعروں نے بے شمار نظمیں لکھیں۔افسانہ نویسوں نے سینکڑوں افسانے اور ناول نگاروں نے متعدد ناول تخلیق کئے۔شاید ہی ہندی، پنجابی اور اردو زبان کا کوئی لکھاری ایسا ہو جس نے اس موضوع پر قلم نہ اٹھایا ہو۔

حواشی

(۱) پون چندرا، کمیونلزم ین ماڈرن انڈیا''، بحوالہ ''فرقہ واریت اور اردو ناول ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۰۵ء ص ۲۳

(۲) عقیل احمد، اردو ناول اور تقسیم ہند، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۹۸۷ء، ص ۱۲

(۳) وقار عظیم، داستان سے افسانے تک، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۹۷ء، ص: ۱۶۲

(۴) ڈاکٹر سید عبداللہ، اردو ادب کی ایک ص: دی، مکتبہ محبان اردو، دہلی ۱۹۸۹ء، ص: ۲۴۱

(۵) مضمون بہ مضمون،، جدید اردو ناول کی تنقید، رسالہ ایوان اردو، ماہنامہ، دہلی ۱۹۹۲ء، ص: ۸

(۶) مشتاق احمد وانی، اردو ادب میں تانیثیت، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۱۳ء، ص: ۴۲۱

(۷) فہمیدہ کبیر، اردو ناول میں عورت کا تص: ور، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی ۱۹۹۲ء، ص: ۳۵

(۸) پروفیسر انور پاشا، ہندو پاک میں اردو ناول، پیش رو پبلی کیشنز، دہلی ۱۹۹۲ء، ص: ۸۱

(۹) رامانند ساگر، اور انسان مر گیا، قادری پریس نور منزل، ممبئی ۱۹۸۴ء، ص: ۲۳۶_۲۴۱

(۱۰) وقار عظیم، داستان سے افسانے تک، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۹۷ء، ص: ۱۸۰

(۱۱) رامانند ساگر، اور انسان مر گیا، قادری پریس نور منزل، ممبئی ۱۹۸۴ء، ص: ۲۷۰

(۱۲) ایضاً، ص: ۲۶۸

(۱۳) ایضاً، ص: ۲۸۳_۲۸۴

(۱۴) عبدالصمد، دوگز زمین، نصرت پبلی شرز، لکھنؤ ۱۹۹۳ء، ص: ۱۶۰

(۱۵) ایضاً، ص: ۲۴

(۱۶) رسالہ ایوان اردو، دہلی، ابوالکلام آزاد، ۱۹۸۸ء، ص: ۴

(۱۷) عبدالصمد، دوگز امین، نصرت پبلی شرز، لکھنؤ ۱۹۹۳ء، ص: ۱۸۵_۱۸۶

(۱۸) ایضاً، ص: ۸۷_۱۸۸

(۱۹) ایضاً، ص: ۸۸_۱۸۹

(۲۰) خدیجہ مستور، زمین، ہمالیہ بک ہاؤس، دہلی ۱۹۸۴ء، ص: ۹

(۲۱) کرشن چندر، غدار'' ایشیا پبلیشرز، دہلی ۱۹۶۷ء، ص: ۱۲

(۲۲) ایضاً،ص:۶۵

(۲۳) حیات اللہ انصاری،،لہو کے پھول، کتاب ادان،لکھنؤ۱۹۶۹ء جلد۴،ص:۲۲۴۰

(۲۴) ایضاً،ص:۲۳۷۹

(۲۵) جیلانی بانو،ایوان غزل''، ناولستان جامعہ نگر، دہلی۱۹۷۶ء،ص:۴۱

(۲۶) ایضاً،ص۳۳۴

(۲۷) عبداللہ حسین،اداس نسلیں،اردو پبلیشرز، دہلی۱۹۸۲ء،ص:۸۷۴

○ ○ ○

باب سوم

ہجرت اور خواتین

ہجرت کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی انسانی زندگی۔ بنی نوع انسان میں سے پہلی ہجرت کس نے کی تھی؟ دنیا کا پہلا مہاجر کون تھا اور ہجرت کے تجربے سے گزرنے کے بعد اس نے کیسا محسوس کیا ہوگا؟ یہ سارے سوالات ایسے ہیں جن کا کوئی واضح جواب تلاش کرنا ناممکنات میں سے ہے۔ کائنات جب وجود میں آئی ہوگی اور اس کے ایک حقیر سیارے 'زمین' پر پہلی دفعجب کوئی انسان چلا ہوگا، تو شاید وہی اس عالم رنگ وبو کا پہلا مہاجر رہا ہوگا، کون جانے! کیا معلوم کہ اسکے نزدیک ہجرت ایک خوش کن تجربہ تھا یا ایک المناک حادثہ؟ اپنی پہلی مٹی سے بچھڑنے کے بعد اس نے گریہ وزاری کی ہوگی یا خوشی ہوا ہوگا کہ اس کے تصرف میں زمین کا ایک نیا قطعہ آ گیا۔

شکم کی آگ لئے پھر رہی ہے شہر بہ شہر
سگ زمانہ ہیں، ہم کیا ہماری ہجرت کیا

(افتخار عارف)

ہجرت کیا ہے اور مہاجر کون ہیں؟ ان سوالوں کے جوب علم سیاست تو آسانی سے دے سکتا ہے، علم سماجیات کے حوالے سے جواب دینے میں شاید کچھ دشواریاں پیش آئیں۔ لیکن ادب کے طالب علم کے لئے یہ سوالات اس قدر سادہ اور آسان نہیں رہ جاتے ہین۔ علم سیاست میں نہایت واضح تفصیلات کے ساتھ مہاجر، رفیوجی، جلاوطن، پناہ گزین، بے وطن وغیرہ کی تعریف و درجہ بندی ممکن ہے۔ علم سماجیات بھی اپنے معیاروں کو بروئے کار لا کر ان اصطلاحوں کی تعریف و درجہ بندی کے فرائض سے عہس برآ ہوسکتا ہے لیکن ادب کا دائرہ کار اتنا وسیع ہے کہ وہ چند محدود معیاروں، پیمانوں اور خانہ بندیوں کو وہ 'ہجرت' کی تعریف و تفہیم کے لئے استعمال نہیں کر سکتا کیونکہ اس کے نزدیک انسان کی ظاہری حالت ہی سب کچھ نہیں ہے انسان کا باطن بھی بے انتہا اہمیت کا حامل ہے۔ لیکن دشواری یہ ہے کہ ادب کی رو سے 'ہجرت' موجوعی ہے جب کہ یہاں ہجرت معروضی تعریف مقصود ہے۔ اس لئے لامحالہ ہمیں 'ہجرت' کی تعریف کے لئے سماجی علوم سے ہی

رجوع رنا ہوگا۔ البتہ ہجرت اور اس کے متعلقات کے حوالے سے اس باب میں ذکر کیا جائے گا۔

ہجرت کا سلسلہ اس قدر پرانہ ہے کہ اس سے متعلق کوئی بھی حتمی رائے قائم کرنا مشکل ہے۔ بعض ہجرتیں تاریخ نیز دیگر شعبۂ علوم کو حوالے سے ہمارے ذہن میں محفوظ ہیں۔ بعض ہجرتوں کے محرکات اور انسے پیدہ شدہ مسائل کا علم ہمیں اس عہد کی ادبی تخلیقات کے ذریعہ ہوتا ہے۔ مثلاً مہاتما گوتم بدھ اور ان کے پنر جنموں کی داستان ہمیں جاتک کتھاؤں میں ملتی ہیں۔ لیکن اس سے قبل کی ہجرتیں بھی مذہبی عقائد وتصورات کے ذریعے ہماری تہذیبی زندگی کا حصہ بن چکی ہیں۔ خطائے گندم خوری کی پاداش میں حضرت آدمؑ جنت سے نکالے گئے اور زمین پر بھیج دئے گئے۔ یہ تصور کسی نہ کسی صورت ہر مذہب میں موجود ہے۔ یعنی حضرت آدمؑ جنت سے حضرت کی اور زمین پر آ گئے۔ گویہ وہ اس عالم رنگ و بو کے پہلے مہاجر ٹھہرے! ان کی ہجرت ہی بنی نوع انسان کی پیدائش کا سبب بنی۔ یا یوں کہ لیں کہ ان کا زمین پر اترنا نسل آدم کی تخلیق کا بہانا بنا۔ یہ پہلی ہجرت ہی اس زمین پر بے شمار انسانوں کے ہونیکا جواز بنی۔

برصغیر ہندو پاک میں انسانی آبادی کی نقل مکانی کا سلسلہ کافی پرانا ہے۔ جنگوں، خانہ جنگیوں اور ریاستی استبداد کے سبب، اشاعت مذہب اور حصول روزگار کے لئے یہاں سے انسانی آبادی کی نقل مکانی قدیم زمانے سے ہوتی آئی ہے۔ البتہ تقسیم ہند کی حیثیت اس سلسلہ میں سنگ میل کی سی ہے جس کی وجہ سے ایک کثیر آبادی انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں سرحد کے دونوں اطراف منتقل ہوئی اور اپنے ساتھ ظلم وستم کی رونگٹے کھڑی کر دینے والی داستانیں لے کر آئی اور پھر اجنبی مٹی میں رچنے بسنے کے عمل میں گوناگوں مسائل ومصائب سے دوچار ہوئی۔ چونکہ ہجرت کرنے والی اس آبادی کا بڑا حصہ اردو بولنے والوں کا تھا، اس لئے مہاجروں کی زندگی، ان کی جدوجہد اور مسائل کی عکاسی سب سے پہلے اردو ادب میں ہی ہوئی اور جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ تقسیم ہند، فرقہ وارانہ فسادات اور ہجرت کی وجہ سے اردو ادب کو موضوعات ومسائل کا ایک وقیع زخیرہ دستیاب ہو گیا۔ جس قدر ان مسائل کو اردو ادب بالخصوص اردو فکشن میں پیش کیا گیا، اس کی نظیر کسی اور ادب پارے میں نہیں ملتی۔

آزادی کے حصول کے ساتھ ہی ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا اور اس کے ساتھ فرقہ وارانہ فسادات

اورانسانی نقل مکانی کے نئے سلسلے شروع ہو گئے۔اس پورے سانحے نے مختلف شعبۂ زندگی سے وابستہ افراد کو بری طرح متاثر کیا۔خاص طور سے شاعر وادیب کو۔ ۱۹۴۷ء کے بعد کے دو دہائیوں میں اردو فکشن میں سب سے زیادہ تقسیم ہند،فرقہ وارانہ فسادات اور ہجرت جیسے مسائل کی عکاسی ہوئی ہے۔اردو کے بیشتر فکشن نگار'دوقومی نظریے'اور تقسیم کی سیاست کو ذہنی طور پر قبول نہیں کر پائے۔ان میں ایسے بھی تخلیق کار تھے جنہوں نے بذات خود اس اندوہناک کرب کو سہا اور اپنی تصنیف کا موضوع بنایا۔انہیں گنگا جمنی تہذیب کی قوتوں پر اس قدر شدید ایقان تھا کہ اس کے بکھرنے کا المیہ انہیں اندر تک ہلا گیا۔رہی سہی کسر فسادات اور اس دوران رونما ہونے والے ہولناک واقعات وحادثات نے پوری کر دی۔اس عہد میں اردو کا شاید ہی کوئی فکشن نگار ہو جس نے ان موضوعات پر ناول نہیں لکھا ہو۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے ۱۹۴۷ء کے بعد کے ناولوں کا تجزیہ ان جملوں میں کرتے ہیں:

''۱۹۴۷ء کے بعد کے ناولوں میں موضوع کے لحاظ سے خاصا تنوع ہے مگر سب سے بڑے موضوع دو ہیں۔اول فسادات دوم تاریخی واقعات۔ان میں سے فسادات کے ناول تو ۱۹۴۷ء کے فسادات وحوادث سے متعلق ہیں۔اور تاریخی ناول ان نئے احساسات کے رہین احسان ہیں جن کے زیر اثر پاکستان وجود میں آیا۔''(۱)

پروفیسر سید محمد عقیل اس ضمن میں یوں رقمطراز ہیں:

''اردو ناول نے اپنے گردوپیش کی زندگی،اس کے نشیب وفراز،ارتقاء وانتشار،سب کو اس اس طرح سمیٹا ہے کہ ملکی،تہذیبی نیز سماجی وہندوستان کی سیاسی تاریخ،سب کا کما حقہ مطالعہ اب ناولوں کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔تقریباً ہر دس برس کے بعد ادب،تہذیب اور سیاست کے بدلتے ہوئے مزاج اور طور طریقوں میں کبھی کبھی تو جیسے بھونچال سا آتا ہوا نظر آتا ہے۔انسان زندہ رہنے اور باقی رہنے لئے کیسے کیسے طریقے اور ترکیبیں اختیار کرتا رہتا ہے کہ بعض اوقات ان کا اندازہ لگانے والوں کو خود ایک تحیر گھیر لیتا ہے جو اس کی بقا اور وجود کے قیام کی میثاق بھی بنتا ہے اور اس کے میدان عمل وفکر کا ایک گراف بھی۔''(۲)

تقسیم ہند کے جلو میں رونما ہونے والے فسادات اور ہجرت نے برصغیر کے لاکھوں خاندانوں کو متاثر کیا۔تقسیم ہند کے سبب لاکھوں افراد اپنے صدیوں پرانے گھروں،ملک وشہر چھوڑ کر اجنبی دیاروں میں

پناہ لینے کے لئے مجبور ہو گئے۔اس دور خونچکاں میں مذہب اور سیاست کے نام پر انسانیت کا گلا گھونٹا گیا۔عورتوں کی بے حرمتی کی گئی،معصوم بچے زندہ جلا دئے گئے۔سہاگنوں کی مانگ اجاڑ دی گئیں، ماؤں کی گودسونی ہوگئیں اور صدہا صدی سے بنائے آشیانے شعلوں کی نذر ہو گئے۔تقسیم ہند کے سبب انسانوں کی ایک بڑی آبادی مہاجر بن گئی۔ابتداء میں مہاجروں کے مسائل کو فرقہ وارانہ فسادات کی پیدہ شدہ صورتحال ہی کا عکس سمجھا گیا۔لیکن رفتہ رفتہ بات واضح ہوتی گئی کہ ہجرت کے اپن مسائل ہیں ھالانکہ کبھی کبھی ان مسائل کی سرحدیں فرقہ وارانہ فسادات جنگوں اور خانہ جنگیوں کے نتیجے میں رونما ہونے والے مسائل سے جا ملتی ہے۔مذہبی جنوں اور نفرت کے مظاہروں کی ادیبوں نے اپنے ناولوں میں بھر پور مذمت کی۔انتظار حسین اردو کے پہلے فکشن نگار ہیں جنہوں نے 'ہجرت' اور اس سے پیدا شدہ مسائل کو تقسیم ہند اور فسادات سے الگ کر کے دیکھا۔کچھ عرصہ گزرنے کے بعد فسادات کی آندھی رک گئی تب اردو کے دیگر ناول نگاروں نے بھی مہاجروں اور ان کی زندگی کو اپنا موضوع بنایا۔قرۃ العین حیدر نے ہجرت اور جلاوطنی کے عمل کو تاریخی پس منظر میں پیش کیا۔تقسیم ہند کے دوران متعدد اردو ناول لکھے گئے جن میں فسادات و ہجرت کو خاص طور سے موضوع بنایا گیا۔

بقول داکٹر معین الدین عقیل:

''مسلسل سیاسی انتشار کے نتیجے میں جب قومی تحریکیں وجود میں آئیں تو اردو ادب نے نہ صرف ان تحریکوں کی جدوجہد کو بیان کیا بلکہ ان میں عملاً حصہ لیا۔''(۳)

جنگوں اور کانہ جنگیوں کے دوران سب سے زیادہ مطالم کا نشانہ عورتوں کو بنایا گیا۔خاص طور پر جنسی استحصال کا۔ انکے جسم کے ساتھ ساتھ روح کو بھی کچلا گیا۔ بوسنیا ہرز گووینا (Bosnia Herzgovina) کی خانہ جنگی پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک کاتوں کارکن سٹاسا زاجووچ (Stasa Zajovic) کہتی ہیں کہ:

''عورت کی کوکھ جیتی ہوئی زمین بن جاتی ہے'' (The female womb becomes occupied territory)(۴)

اس ضمن میں ریتو مینن اور کملا بھاشن بھی رقمطراز ہیں:

''ہر جنگجو (متحارب) فریق عورت کے جسم کو ایسا علاقہ تصور کرتا ہے جسے فتح کرنا، اپنی ملکیت بنا لیتا ہے یا داغدار کر دیتا ہے۔'' (۵)

ہمارا معاشرہ مذہبی اور سماجی عقائد کی وجہ سے عورت اور اس کے جنسی رویوں کو قوم کی عزت ووقار کے ساتھ مشروط کر دیتا ہے۔اس لئے عورت کی جنسی طہارت کو پامال کرنا مغلوب فرقے کو مکمل برتری کی نشانی تسلیم کی جاتی ہے۔اس کا عملی مظاہرہ مقتدر طبقہ دوسروں کی عورت کا اغوا کر کے یا اس کے ساتھ زنا بالجبر کرتا ہے۔تقسیم ہند کے دوران عورتیں تشدد کا سب سے برا ہدف بنائی گئی ہیں۔اس دور خونچکاں میں عورتیں نہ صرف بے گھر ہوئیں، اپنی مٹی سے بچھڑ بھی گئیں، اپنے رشتہ داروں نیز عزیز واقارب سے سور ہوئیں بلکہ بے حرمتی اور زنا بالجبر کا نشانہ بھی بنیں۔ جبری زنا کے بعد یا تو انہیں ہلاک کر دیا گیا، یا انہیں حالات کے ٹھوکروں پر چھوڑ دیا گیا، یا پھر انہیں مجبور کر دیا گیا کہ ظالم فرقے کے اجنبی مرد کے ساتھ وہ ایک نیا گھر بسائیں۔زیادتیوں کی شکار یہ عورتیں دوطرفہ مسائل کے نرغے میں آجاتی ہیں۔استحصالی فرقہ انہیں تفریح کا ذریعہ بنالیتا ہے اور کسی صورت وہ اگر اپنے فرقے والوں میں پہچانی جاتی ہیں تو ان کا فرقہ انہیں معاشرے میں قبول نہیں کرتا، کیونکہ ہر فرقے عورتوں کی جنسی طہارت کے حوالے سے اپنے فرقے کی خالص بنیادوں کو برقرار رکھنے پر اصرار کرتا ہے۔

ایسی صورتحال سے دوچار عورتیں ایک عجیب وغریب زندگی گزارنے کیلئے مجبور ہو جاتی ہیں۔اگر وہ اجنبی فرقے والوں کے درمیان رہ گئیں تو انہیں جنسی کھلونا سمجھ کر نہ صرف ان کے جسم بلکہ ان کی روح کو بار بار پامال کرتے رہتے ہیں اور اگر وہ اپنے لوگوں میں لوٹ آئیں تو ان کا اپنا فرقہ انہیں کبھی بھی سماجی قبولیت کا درجہ نہیں دیتا ہے۔علاوہ ازیں اجنبی سماج میں مہاجر عورتیں سب سے کمزور، ناتواں اور بے سہارا ہوتی ہیں۔ اور اگر بدقسمتی سے انہیں کسی مرد کا سہارا نصیب نہ ہو تو ان کا جنسی استحصال نیا معاشرہ دل کھول کر کرتا ہے۔دنیا میں کئی ایسے ممالک ہیں جہاں دوسرے ملکوں سے لائی گئی عورتیں جسم فروشی کے لئے مجبور کر دی جاتی ہیں۔

آزادئ ہند سے قبل کی ہندوستانی تاریخ کا ایک المناک پہلو یہ ہے کہ ہندو مسلمان کے درمیان قومی منافرت اور فرقہ وارانہ عصبیت کی ایک خلیج پیدا ہو جاتی ہے۔لیکن اگر مسلمانوں کی سیاسی صورتحال کا جائزہ لیا جائے تو تاریخ کا ایک شرمناک پہلو یہ بھی سامنے آئے گا کہ مسلمان خود مسلمان کی نگاہ میں مطعون وملعون

تھے۔سیاسی ناسمجھی کے باعث مسلمانوں میں اتحاد واتفاق کا فقدان تھا۔ملی شیرازہ بندی ناپید تھی۔مسلمانوں کا وہ گروہ جو مطالبۂ پاکستان کو اولین مقصد سمجھتا تھا۔اس کا تعلق مسلم لیگ سے تھا۔ناول 'میرے بھی صنم خانے' میں مسلمانوں کے ملی انتشار اور ذہنی کشمکش کی یہ کیفیت بدرجۂ تم موجود ہے۔ایک جگہ اس چپکلش کی ناگفتہ بہہ نوعیت دیکھئے:

''مسلمان.....لاحول ولاء.....مولانا نے داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا۔'کنور عرفان کی اولاد ایک سرے سے مسلمان ہی نہیں ہے۔ان کے لڑکے شراب وہ پئیں،انگریزی ناچ وہ ناچیں، ہر وقت کا انگریزوں، کافرون کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا،سؤر بھی یقیناً کھاتے ہوں گے، بلکہ میرا تو خیال ہے کہ ان کی لڑکی شادی بھی کسی ہندو سے کرے گی۔''(۶)

ناول 'میرے بھی صنم خانے' میں تقسیم ہند کے المیے کی ایک صورت یہ بھی ملتی ہے کہ پاکستان کا قیام عمل میں آنے کے بعد مطالبۂ پاکستان سے وابستگی رکھنے والے اکثر مسلمان تو ہجرت کر گئے لیکن ایسے نیشنلسٹ مسلمان جن کی ہندوستان سے غایت درجے کی انسیت تھی انہوں نے فرقہ وارانہ فسادات کے خوں آشام واقعات کے باوجود اپنے آبائی وطن ہندوستا سے ہجرت کر جانا مناسب نہیں سمجھا۔مگر فسادیوں، بلوائیوں اور شرنارتھیوں نے ان کے اس وفادارانہ عمل کی کوئی قدر نہیں کی۔چنانچہ وہ مشکوک نگاہوں سے دیکھے جانے لگے۔رخشندہ کی ایک ہندو دوست کے مشورے میں یہ کیفیت پوشیدہ ہے مثلاً:

''روشی ڈارلنگ تم مسلمان ہو اس لئے بندی لگا کر کوروکشیتر کیمپ تک ہمارے ساتھ چلنا۔ ہمارے شرنارتھ مسلمانوں کے نام سے ہی اب اتنی نفرت کرتے ہیں کہ وہ تمہیں دیکھنا برداشت نہیں کرسکیں گے۔''(۷)

تقسیم ہند کے المیے کے موضوع پر 'میرے بھی صنم خانے' ایک منفرد ناول ہے۔اس ضمن میں پروفیسر یوسف سرمست نے بیحد متوازن رائے پیش کی ہے کہ:

''قرۃ العین حیدر کا یہ دعویٰ حق بہ جانب ہے کہ انہوں نے اس ناول میں ایک عظیم انسانی ٹریجڈی کی داستان قلم بند کی ہے۔جس کی وجہ سے لاکھوں انسانوں کا خون بہایا گیا اور ایک ایسے تمدن اور ایک ایسی ثقافت کو ختم کیا گیا جو صدیوں کے اتحاد کی ایک عظیم الشان نشانی تھی۔'' (۸)

مسلم لیگ جس کلچر زبان اور روایات کے تحفظ کے لئے ایک الگ آزاد ملک کا مطالبہ کر رہی تھی اس

میں وہ علاقے شامل نہیں ہوئے جس میں اس تہذیب نے آنکھیں کھولی تھیں۔لکھنؤ جو ہندو مسلم مشترکہ کلچر کا گہوارہ تھا پاکستان میں شامل نہ ہوسکا۔لکھنؤ میں سندھ بلوچستان اور پنجاب سے مہاجر آکر بسنے لگے تھے۔ جس سے لکھنؤ کا کلچر تبدیل ہوگیا۔تقسیم کے بعد ہندوستان میں مسلمان بدحال ہوگئے۔ان کو سرکاری نوکریوں سے برطرف کیا جارہا تھا۔مسلمانوں کے کاروبار زوال پزیری کی طرف گامزن تھا۔ ہندو مسلم جو مشترکہ تہذیب کی علامت تھے اور صدیوں سے ایک دوسرے کے ساتھ رہتے آرہے تھے آج ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوگئے۔مسلم معاشرت کی بدحالی اور لکھنؤ کے ماحول کی تبدیلی کا ذکر نہایت مؤثر طریقے سے ناول میں بیان کیا گیا ہے:

> ''لکھنؤ کے قہوہ خانوں اور تفریح گاہوں کی رونق پہلے سے دوگنی دوگنی ہوگئی تھی۔فیشن ایبل دوکانوں پر چاندی برس رہی تھی۔اکثر شاموں کو حضرت گنج پر بالکل لاہور کے ماحول کا دھوکا ہوتا تھا۔ ہر روز نت نئے پروگرام اور آزادی منانے کے جشن منعقد کئے جا رہے تھے..... مسلمانوں کو ریلوے کی کھڑکیوں سے باہر پھینکا جارہا تھا..... مسلمانوں کے کاروبار معطل ہو چکے تھے۔انہیں ہر جگہ کتے سے برتر سمجھا جارہا تھا اور کتے کی موت مارنے کے ارادے کئے جارہے تھے۔کل بھارت کوی سمیلن منعقد ہونے والا تھا۔ ہر طرف بڑا شدید قومی جوش وخروش طاری تھا۔مسلمان خوف وہراس سے سہمے جاتے تھے انہوں نے اپنے مکانوں اور کوٹھیوں پر اپنے ناموں کے بورڈ اتار دئے تھے۔ریلوں میں سفر کے لئے ہندو نام تجویز کر لئے تھے..... مسلمان زمیندار کو اپنی عاقبت نظر آرہی تھی۔کاروباری الگ ہاتھ ہاتھ پر دھرے رو رہے تھے۔ملازمت پیشہ مسلمانوں کو بہانے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نوکریوں سے برطرف کیا جارہا تھا۔''(۹)

قرۃ العین حیدر کو لکھنؤ اور لکھنؤ کی تہذیب سے بے حد محبت ہے تہذیب کی تبدیلی کو انہوں نے ایک لکھنؤی کی حیثیت سے محسوس کیا۔اور اس کا بیان ''میرے بھی صنم خانے'' میں خوبصورت انداز میں پیش کیا۔

عبداللہ حسین کا ناول 'اداس نسلیں' پہلی جنگ عظیم سے لے کر قیام پاکستان کے دور تک کا احاطہ کرتا ہے۔اس ناول میں اس دور کی ہندوستانی سیاست کے سبھی اہم واقعات کو اہمیت دی گئی ہے،لیکن قیام پاکستان اور اس کے نتیجے میں ہجرت کے حادثہ کو جس فنی چابکدستی سے بیان کیا گیا اس سے نہ صرف اس کی

جیتی جاگتی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے بلکہ ہجرت کرنے والوں کے المیے کا احساس بھی شدت سے ہونے لگتا ہے۔ قیام پاکستان کا مطالبہ مذہبی بنیادوں پر اٹھایا گیا تھا اور آزادی کے ساتھ ساتھ ملک بھی دو حصوں میں منقسم ہو گیا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے لے کر ہندوستانی سیاست کے سبھی بڑے سورما تقسیم ہند سے پیدا شدہ صورتحال پر دم بخود تھے۔

تقسیم ہند کے لئے ذمہ دار سیاست کو اردو کے مختلف ناولوں میں بھرپور طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔ 'اداس نسلیں' میں بھی اسی سیاست کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اس میں ہجرت کرنے والوں پر جو گزری اس کی بہت ہی مفصل روداد موجود ہے۔ اس ضمن میں 'اداس نسلیں' کا مقابلہ اردو کا کوئی ناول شاید ہی کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں صرف مہاجروں کے قافلے نیز ہجرت کرنے کے عمل میں عورت پر گزرنے والے واقعات و حادثات کا جائزہ لیا جائے گا۔ ہندوستان میں فسادات تو قیام پاکستان کے اعلان سے بھی ہوا کرتے تھے لیکن ان وقتوں میں فسادات کچھ مخصوص مقامات اور محدود پیمانے پر ہی ہوا کرتے تھے۔ تقسیم ہند کے جلو میں فرقہ وارانہ نفرت کی زبردست آندھی چلی اور دیکھتے دیکھتے فسادات و ہجرت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ لوگ شہر چھوڑنے لگے، ریل گاڑیاں کم پڑ گئیں تو جان بچا کر بھاگنے والوں کے قافلے کے قافلے پیدل چل پڑے، اور فسادات کی حیوانیت سر پر سوار ہوئی تو بالکل بوکھلا گئے اور گھر بار چھوڑ کر منزل کا تعین کئے بغیر بھاگ اٹھے۔ نہ منزل کا پتہ اور نہ راستے کی خبر۔

بقول عقیل احمد:

> ''ناول نگار نے ناول کے وسیع کینوس میں جاگیردارانہ نظام، شہری اور دیہی زندگی کو پیش کیا ہے جس میں ہندوستان کا سیاسی ماحول بھی شامل ہے۔ تقسیم کے بعد جاگیردار کا خاندان بکھر جاتا ہے اور وہ نئے ملک پاکستان میں پھر سے اپنی حیثیت نئے طریقے سے بنا لیتا ہے۔ لیکن کسان مزدور جو ہندوستان چھوڑ کر گئے پاکستان میں بھی اپنا مقام قائم نہ کر سکے۔''(۱۰)

تقسیم ہند کے پورے پس منظر میں یہ ناول پھیلا ہوا ہے۔ ناول یوپی اور پنجاب کے بیچ کے علاقے کی تہذیب کو پیش کرتا ہے۔ کہانی روشن پور گاؤں کی ہے جو دہلی اور پنجاب کی سرحد پر واقع ہے۔ اس گاؤں میں ہندو، سکھ، مسلمان سبھی آباد ہیں۔ جو ابتدا سے ہی دو گروہوں میں منقسم ہیں۔ ان کی زبان پنجابی ہے۔

روشن علی، نعیم اور عذرا ناول کے اہم کردار ہیں۔ روشن علی روشن پور کے گاؤں کے سربراہ ہیں، نعیم نوجوان نسل کا نمائندہ اور ناول کا ہیرو ہے جو نواب کی لڑکی عذرا سے شادی کرتا ہے۔ فسادات ہونے کی وجہ سے وہ بھی نقل مکانی کی غرض سے باقی لوگوں کے ساتھ شامل ہو جاتا ہے۔ دہلی سے روانہ ہونے والے قافلے کا حجم جس تیزی سے بڑھا تھا وہ پنجاب میں گم ہوتا چلا گیا۔ جوں جوں وہ پنجاب میں اندر آتے گئے حملوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ قافلے والے حملہ آوروں کا مقابلہ کرتے رہے لیکن یہ مزاحمت بہت دیر تک جاری نہ رہ سکی۔ اس سے بڑی بات یہ ہوئی کہ حملہ آوروں کا مقابلہ کرتے رہے، لیکن مزاحمت بہت دیر تک جاری نہ رہ سکی۔ اس سے بڑی بات یہ ہوئی کہ حملہ آور خود بھی لوگوں کو مارتے تنگ آ گئے تھے۔ اس لئے کہ ہر چیز کی انتہا کے بعد ایک تعطل آنا لازمی امر ہے۔

> ''وہ (حملہ آور) مار مار کر کس قدر اکتا چکے ہوتے کہ محض سڑک کنارے بیٹھے نئے قافلے کے خاموش، خوف زدہ کوچ سے ہی محظوظ ہوتے رہتے۔ کبھی کبھی وہ مردہ اور زخمیوں کو ایک جگہ اکٹھا کر کے آگ لگا دیتے اور نیا قافلہ چپ سادھے، بھاگتا ہوا ان کے قریب سے گزر جاتا۔''(۱۱)

دن کے سفر کی تکان کے بعد جب قافلہ شب گزاری کے لئے کہیں قیام کرتا تو سبھی لوگ اللہ کا شکر بجا لاتے کہ ہنوز وہ زندہ ہیں اور زندہ رہنے کی خواہش کے سبب ہی برداشت کرتے آ رہے تھے۔ ورنہ نعیم کی طرح انہیں بھی ہمیشہ کے لئے پس منظر سے غائب ہو جانا چاہئے تھا۔ مگر زندہ رہنے کے بعد شکم کی آگ سے کسی کو مفر نہیں۔

> ''جن کے پاس آٹا نہ تھا وہ بھاری رقمیں دے کر پڑوسیوں سے آٹا خریدنے لگے۔ جن کے پاس پیسے نہ تھے وہ رات کا انتظار کرنے لگے۔ جب اندھیرے میں چوری کی جا سکتی تھی۔ یا گھر کی عورتوں میں سے کسی جوان اور خوش شکل کو تھوڑی دیر کے لئے کسی دوسرے کے حوالے کر کے....معاوضے میں اشیاء خوردنی حاصل کی جا سکتی تھیں۔''(۱۲)

عذرا نواب روشن آغا کی لڑکی ہے، تعلیم یافتہ ہے۔ طبقاتی امتیاز کے باوجود نعیم سے شادی کرتی ہے۔ اس سے محبت کی بنا پر تحریک آزادی میں شامل ہوتی ہچس سے گاؤں میں ناپسندیدگی کی فضا قائم ہو جاتی ہے۔ نعیم سے عشق ہونے کے باوجود زندگی میں سکون نہ حاصل کر سکی۔ تقسیم ملک کے وقت اس کے شوہر کی گمشدگی کے بعد گھر میں اس کا مرتبہ کمتر تھا۔ عذرا کی بھابھی اسے حقارت کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔

''اس کی بیوی کا عذرا کی طرف جو پرانا برتری کا رویہ قائم تھا اس میں اس کے لئے حقارت بھی شامل ہو چکی تھی۔ کہ پہلے ہجرت اور موروثی جائداد کی گم کردگی اور اس کے بعد اس کے کاوند کی گم شدگی اور روشن آغا کی موت سے اس گھر میں اب اس کی حیثیت صفر کے برابر رہ گئی تھی اور زندگی کی کوئی شے اس کے حق میں نہ رہی تھی۔'' (۱۳)

'اداس نسلیں' میں ہجرت کی اندوہناک کیفیت موجود ہے۔ روشن محل کو فسادات کی زد میں آنے کے آثار ظاہر ہونے پر پرویز روشن آغا کو اپنے کنبے کے ساتھ پاکستان ہجرت کر جانے کا مشورہ دیتا ہے۔ مگر روشن آغا اپنا آبائی وطن ترک کرنے کے قائل نہیں۔ چنانچہ پرویز اپنے کو خیر باد کہتا ہوا پاکستان کا رخ اختیار کرتا ہے۔ اور چند ہی گھنٹے کے بعد روشن محل اور روشن آغا کو فسادیوں نے اپنا نشانہ بنالیا ہے۔ یہ صورتحال کتنی افسوس ناک ہے ملاحظہ ہو:

'' شام تک روشن محل کے تمام لوگ غائب ہو گئے۔ چوکیدار کا کروب تک۔ صرف روشن آغا کا ملازم خصوصی حسین، وفاداری سے ان کے بند دروازے سے لگ کر بیٹھا رہا۔ رات سے پہلے پہلے روشن محل کو آگ لگا دی گئی... بلوائیوں کے تین گروہ یکے بعد دیگرے جانے کہاں سے وارد ہوئے اور نہایت خاموشی سے اس مہیب اور دو منزلہ عمارت کا مشرقی حصہ جلنے لگا۔.....روشن آغا اور حسین پچھلے دروازوں سے جان بچا کر بھاگے۔ جاتے جاتے ان بلوائیوں کی جھلک دیکھی وہ لمبے تڑنگے سکھ کسان اور چھوٹی ذاتوں کے کالے کالے لوگ تھے جو ان کا سامان نکال نکال کر لان میں جمع کر رہے تھے اور اسے آگ لگا کر بھوتوں کی طرح شور مچا رہے تھے۔'' (۱۴)

فرقہ وارانہ فسادات کے زیر اثر دونوں ملکوں میں ہجرت کے عمل کا وجود ہوا۔ عبداللہ حسین نے مہاجر قافلوں کی منظر کشی مؤثر صورت میں کی ہے۔ قافلوں پر بلوائیوں اور شر پسندوں کے حملے ہوتے رہتے تھے۔ مندرجہ ذیل میں اقتباس میں حملہ آوروں کی بربریت اور مہاجر قافلوں پر غور فرمائیں:

''جوں جوں وہ پنجاب میں اندر آتے گئے حملوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہ حملے مسلح اور نیم مسلح دستوں کی طرف سے ہو رہے تھے جو کہ زیادہ تر دیہات میں سے آتے تھے پہلے پہل تو قافلے والے کچھ نہ کچھ ان کا مقابلہ کرتے رہے، اب وہ اس قدر تھک چکے تھے کہ حملہ آوروں کے ہتھیاروں کے سامنے کاموشی سے مر جاتے یا بھاگنے لگتے۔ ہر حملہ کے بعد مردوں اور زخمیوں کو

پھلانگتے ہوئے، روندتے ہوئے قافلے والے آگے نکل جاتے، کئی ایک سمت کا احساس کھو کر قافلے سے بچھڑ جاتے اور نوجوان عورتیں اغوا کر لی جاتیں.....بعض دفع اگلے قافلوں کے حملہ آور انہیں بغیر کچھ کہے گزر جانے دیتے۔ وہ مار مار کر اس قدر اکتا چکے ہوتے کہ محض سڑک کنارے بیٹھے نئے قافلے کے خاموش، خوف زدہ کوچ سے ہی محفوظ ہوتے رہتے۔ کبھی کبھی وہ مردوں اور زخمیوں کو ایک جگہ اٹھا کر آگ لگا دیتے۔''(۱۵)

ایسی ہی بربریت کا تذکرہ ایک اور جگہ کرتے ہیں ملاحظہ فرمائیں:

''سب کے نزدیک اہم ترین کام چلتے جانا اور اکٹھے رہنا تھا۔ لوگ مر رہے تھے۔ جو مارے جانے سے بچ رہتے وہ تھک کر گر رہے تھے۔ سامان کو آگ لگائی جا رہی تھی اور لوگ خوراک کے لئے آپس میں لڑ رہے تھے۔ سڑک پر اور سڑک کے کنارے لاشوں کا طویل سلسلہ تھا۔ کوئی پلیا کے پتھر کے سہارے بیٹھا اور کوئی درخت کے ساتھ کھڑا کھڑا مر گیا تھا۔ عورتوں کے ننگے مردہ جسم بے شرمی سے پھیلے ہوئے تھے اور جنگلی جانور اور پرندے ان پر پل رہے تھے۔''(۱۶)

ڈاکٹر خالد اشرف کا خیال درست ہے کہ:

''مہاجر قافلے پر گزرنے والی مختلف ذہنی ونفسیاتی کیفیتوں، راستے میں پیش آنے والی مصیبتوں اور جان و مال کے نقصان کو عبداللہ حسین نے اس قدر مہارت اور نفسیاتی بصیرت کے ساتھ پیش کیا ہے کہ تمام اردو ادب میں ہجرت کرنے والے قافلوں کی اتنی حقیقی تصویر کہیں اور نہیں ملتی۔''(۱۷)

تقسیم ہند اور ہجرت کے موضوع کو قرۃ العین حیدر نے بڑی مہارت کے ساتھ اپنے ناولوں میں پیش کیا ہے۔ جس میں سیاست، مذہب اور تاریخ کے علاوہ ہجرت کے دوران عورت پر ہونے والی بربریت اور ظلم کو نہایت عمدگی حقیقی تناظر میں اس کا محاکمہ کیا ہے۔ کہ آنکھوں میں آنسو اور ذہن و دل میں غصہ ابھرنے لگتا ہے۔ زیر نظر ناول میں ارون راجونس کا ردعمل نہ صرف قابل غور ہے بلکہ تقسیم ہند اور فرقہ وارانہ ماحول کی بھی غمازی کرتا ہے:

''میری پیاری دھرم بہن.....اس نے نفرت سے بھری آواز میں کہا۔ سولہ سال تک تم میرے ہاتھوں میں راکھی باندھتی رہی لیکن آج کی رات میں تمہاری حفاظت کو نہیں آ سکتا۔'' (۱۸)

اس اقتباس میں ایک بھائی کی بے چارگی اور بہن کے تئیں اس کی مجبوری دیکھی جاسکتی ہے۔ جسے قرۃ العین حیدر نے پیش کی ہے۔

تقسیم ہند کی ہولناکیوں نے انسان کو انسانیت سے الگ کر کے وحشیانہ طرز عمل پر آمادہ کر دیا جس سے غارت گری اور بربریت کو فروغ ملا۔ یہ ہندوستانی تاریخ کا عظیم سانحہ اور تقسیم ہند کا زبردست المیہ ہے ۔اس المیے کو قرۃ العین حیدر نے اپنے ناولوں میں نہایت جرئات مندی، باریک بینی اور فنکارانہ طریقے سے اس سانحے کی عکاسی کی ہے۔ ناول 'سفینۂ غم دل' میں بھی تقسیم ہند کے افسوس ناک سانحوں کا ذکر موجود ہے۔ناول نگار نے ایک مقام پر ان بلوائیوں اور شر پسندوں کی زیادتیوں کو پیش کیا ہے۔جنہوں نے فرقہ وارانہ فساد کے سلسلہ میں گھروں کو نذر آتش کر دیا۔ذیل کے اقتباس کی المناکیاں ملاحظہ ہو:

> ''میں نے اس اندھیرے میں ہاتھ بڑھا کر اٹھنا چاہا لیکن چاروں اور سے بہت ساری چیزوں نے مجھے دبا دیا تھا اور میری سانس رکی ہوئی تھی۔ہم کیا ہیں، یہ کیا ہو رہا ہے، مہا کلپ کا یہ کون سا دور ہے؟ دھوئیں کے بادلوں کو اپنے چہرے سے ہٹاتے ہوئے میں نے دیکھنے کی کوشش کی .....یہ سامنے جو جلے ہوئے راکھ کے ڈیر پڑے ہوئے ہیں یہ 'آشیانہ' ہے جسے میرے مرحوم باپ نے مدتیں گزریں بڑے چاؤ سے تعمیر کرایا تھا اور آج ۹/جون ہے اور آج سمے بالآخر ہم نے اپنی قسمت کا فیصلہ دیکھ لیا ہے۔''(۱۹)

تقسیم کے المیہ کو سمجھنے کے لئے قرۃ العین حیدر نے اپنے ناولوں میں چند کرداروں کی سیرت پیش کرنے میں اپنی فنکاری کی ایسی جوت جگائی ہے کہ تقسیم کے ناولوں کا ذکر ہوتے ہی ان کے کرداروں کے خد وخال قاری کے ذہن میں ابھرنے لگتے ہیں۔''میرے بھی صنم خانے'' کی رخشندہ عرف روشی،''سفینۂ غم دل'' کی علامتی طور پر خود مصنفہ،''آگ کا دریا'' کا ابوالمنصور کمال اور''آخر شب کے ہم سفر'' کی دیپالی سرکار اور یاسمین بلمونٹ متعلقہ ناولوں کے نمائندہ کردار ہیں جو تقسیم ملک اور ہجرت کی المناکیوں کی ترجمانی کرتے نظر آرہے ہیں۔ابوالمنصور کمال سلطان حسین کے ساتھ متحدہ ہندوستان میں داخل ہوا ہے اور تقسیم ملک کے بعد یہ پاکستان میں پناہ لیتا ہے۔ممتاز خان نے ابوالمنصور کمال کی ہجرت در ہجرت کے پیش نظر یہ رائے قائم کی ہے کہ:

''کمال کے حوالے سے ہجرت اور ناسٹلجیا(Nostalgia) کے پہلو رقم ہوتے ہیں۔اپنی سر زمین چھوڑ کر ہندوستان کو اپنا مستقر بنانے والے کو نئی سرزمین پاکستان جانا پڑتا ہے۔گویا تاریخ بتاتی ہے کہ انسان مستقل ہجرتی سفر میں ہے۔وہ کہاں پیدا ہوا اور کہاں دفن ہوا یہ اس کے اختیار میں نہیں رہا۔''(۲۰)

آگے چل کر انگریزوں کی پیدا کردہ یہ فرقہ وارانہ کشیدگی اور مذہبی عصبیت نے ملک ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر کے متحدہ قومیت اور ملکی سالمیت کی بنیاد کی بیخ کنی کر دی۔تقسیم کے بعد دونوں ملک اپنی تہذیبی شناخت کے دعویدار اس طرح ہیں:

''ہندوستان پوری کوشش کر کے یہ ثابت کرنے میں مصروف ہے کہ تقسیم غلط تھی اور ملک دراصل ایک ہے اور اس کی تہذیب ناقابل تسلیم، پاکستان یہ ثابت کرتا ہے کہ تقسیم بالکل جائز اور صحیح تھی ار یہاں کی کلچر بیحد مختلف ہے اور اسی علیحدہ قومیت کی بنیاد پر یہ ملک حاصل کیا گیا ہے۔ادھر ہندوستان کا کہنا ہے کہ سارے مشرق کی تہذیب کا منبع اس کی کلچر ہے۔ادھر گپتا پیریڈ پر روشنی ڈالی جاتی ہے ادھر خلافت راشدہ اور عباسیوں اور مغلوں کے زمانے کے راگ الاپے جاتے ہیں۔''(۲۱)

ملک کی تقسیم اور آزادی کے زیر اثر فرقہ وارانہ فسادات اور خون آشام واقعات کی بنا پر فرد کی تنہائی اور جلاوطنی کا احساس جو نمایا ہوا تھا اسے قرۃ العین حیدر نے'' آگ کا دریا'' میں بڑی چابکدستی اور ہنرمندی سے پیش کیا ہے۔

ہجرت کے موضوع پر انتظار حسین کا ناول 'بستی' خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔اس ناول کے کینوس میں مہاجرین کے المناک مسائل ملتے ہیں۔فرقہ وارانہ فسادات اور ہجرت کا ذکر ناسٹلجیائی انداز میں تہذیبی سطح پر ہوا ہے جو تقسیم ہند کا ناقابل فراموش المیہ ہے۔ناول نگار نے ان المناکیوں کو نہایت ہی مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔اس کیفیت کو انتظار حسین نے نہایت ہی کربناک پیرائے میں زیر نظر ناول میں جگہ دی ہے۔ناول 'بستی' سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''ایک لمبے ٹھنڈے سانس کے بعد وہ (ذاکر کی ماں) روپ نگر کے سفر سے واپس آئیں۔واپسی پر انہیں اس چھوٹے سے کرائے کے گھر کے در دیوار کتنے عجیب اور اجنبی نظر آئے۔تھوڑی دیر کے

لئے وہ پھر گم ہو گئیں۔ پھر اچانک بولیں۔'اجی میں نے کہا کہ کوٹھری کے تالے کی چابی کہاں ہے؟ کوٹھری؟ کون سی کوٹھری؟ اے ہے ابھی سے بھول گئے۔ اپنی حویلی میں کوٹھری نہیں تھی.....میں نے پاکستان چلنے سے پہلے بار بار تم سے کہا کہ میں روپ نگر کا ایک پھیرا لگا آؤں اور جو چیز وہاں سے لینی ہو لے آؤں، مگر تم نے میری ایک نہ سنی،.....ذاکر کی ماں تمہیں یاد نہیں کہ اس وقت گاڑیوں میں کیا ہو رہا تھا۔'' (۲۲)

تقسیم ہند کا المیہ نہ صرف اس امر میں ہے کہ ذی شعور اور خوش حال طبقہ ہجرت کے بعد ذہنی اور مالی پریشانیوں میں مبتلا ہوا بلکہ غمناک بات تو یہ ہے کہ ہندوستان میں ہجرت سے قبل امرا اور رؤسا کے دربار میں ملازمت کرنے والے ہجرت کے بعد پاکستان میں اپنی مکارانہ بساط کے مطابق شرنارتھیوں کے مکانوں اور پلاٹوں کو قبضہ کرنے اور الاٹ کرانے میں پیش پیش رہتے ہیں اور جب کبھی ان کی ہندوستان کے امرا سے ملاقاتیں ہوتی ہیں تو ان کی بے مروتی اور طوطا چشمی انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ ذیل کی عبارت سے کچھ ایسے ہی خیالات سامنے آتے ہیں:

''ابا جان نے امی کو دیکھا کچھ ناخوش سی نظروں سے، پھر بولے.....والد مرحوم نے اپنے وقت میں کس کس کو فیض نہیں پہنچایا، مگر جی جلتا ہے بات زبان پر آجاتی ہے۔ واں پر کیا اوقات تھی؟ یاں آ کے گنجے کو ناخون مل گئے۔'ذاکر کی ماں' ابا جان کے لہجے میں سرزنش کا رنگ تھا۔ اللہ غرور کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

ہاں مگر تم نے تو غرور کبھی نہیں کیا تھا۔ خدا نے تمہیں کتنا پسند کیا۔ آج سر چھپانے کے لئے کوئی کونہ نہیں ہے۔ امی نے جلے بھنے لہجے میں کہا اور چپ ہو گئیں۔'' (۲۳)

عام طور سے متحدہ ہندوستان کی تقسیم کے المیے کے محرک فرقہ وارانہ فسادات ہیں۔ ہجرت فسادات کی مرہون منت ہے۔'بستی' میں انتظار حسین نے تقسیم ہند کے المیے کو نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ مندرجہ ذیل عبارت کی منظر کشی متذکرہ امور کی غمازی کرتی ہے:

''کوچے ویران، گلیاں سنسان، دریچے بند، دروازے مقفل، مسجد ہو حق کرتی تھی، وہ جب امامت کے لئے کھڑا ہوا تھا تو نمازی صف بہ صف صحن مسجد کی آخری حد تک کھڑے تھے۔ جب سلام پھیرنے کے بعد اس نے مڑ کر دیکھا تو صفیں صاف مسجد خالی۔ وہ مسجد میں نمازیوں کے جلو میں داخل ہوتھا اکیلا مسجد سے رخصت ہوا۔'' (۲۴)

مذکورہ گفتگو کے تناظر میں یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ناول ''بستی'' میں انتظار حسین نے تقسیم ہند کے المیے کو بڑی فنکاری اور حقیقت پسندی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر پاشا کی یہ رائے صداقت سے خالی نہیں ہے کہ:

''انتظار حسین کے ناول ''بستی'' میں ہجرت کا کرب اور مہاجرین کی نفسیاتی تموج، شکست خوردگی اور آبادی میں ویرانی کے احساس کی شدت نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے۔'' (۲۵)

اس خیال کی تصدیق ذیل عبارت سے ہوتی ہے۔ جو مہاجرین کے مسائل و مشکلات کی آئینہ داری کرنے میں بے مثل ہے۔ ذاکر اپنی آپ بیتی اس طرح سناتا ہے:

''میں جب گھر سے چلا تھا تو میرے سارے بال سفید تھے۔ اس وقت یری عمر ہی کیا تھی؟ بیس اکیس کے پیٹے میں تھا۔ جب پاکستان پہنچا اور نہانے کے بعد آئینہ دیکھا تو میرے سر کے سارے بال سفید ہو چکے تھے۔ یہ پاکستان میں میرا پہلا دن تھا۔ گھر سے کالے بالوں اور خاندان والوں کے ساھت نکلا تھا۔ پاکستان پہنچا تو میرا سر سفید تھا اور میں اکیلا تھا۔'' (۲۶)

محولۂ بالا عبارت میں ذاکر کی آپ بیتی کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ ''بستی'' اس ضمن میں ایک منفرد اور کامیاب ناول ہے۔ جس میں انتظار حسین نے تقسیم ہند کے المیے کا جائزہ مشترکہ تہذیب کے پس منظر میں لیا ہے۔

ناول ''تذکرہ'' میں انتظار حسین نے ہجرت کے بعد پاکستانی مسلمانوں کے حوالے سے اس امر کو پیش کیا ہے کہ وہ رئیس گھرانہ جس کی ہندوستان میں عظیم الشان عمارت اور والی شان حویلی تھی پاکستان میں اسے مکان کی تلاش میں در در بھٹکنا پڑا پھر بھی اسے چین کی زندگی نصیب نہیں ہوئی۔ اخلاق کا کردار اس صورت حال کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔ اسے یکے بعد دیگرے متعدد مکانوں میں کرائے کے طور پر مقیم ہونا پڑا۔ جب کہ ہندوستان میں اس کے پاس ''چراغ حویلی'' کے نام سے ایسا معروف محل تھا جس کی:

''برجیاں تو ایسی خوبصورت تھیں کہ قلعہ نظر آتی تھی۔ تھی تو اتنی اونچی اسٹیشن سے اس کی برجیاں نظر آنے لگتی تھیں۔ اللہ رکھو نگر میں سب سے اونچی عمارت تھی اور پھاٹک کتنا اونچا ہے کہ ہاتھی مع ہودے کے اس میں سے گزر جائے۔ قدم رکھتے ہوئے لگتا کہ قلعہ میں داخل ہو رہے ہیں۔'' (۲۷)

یہ بیان اخلاق کی والدہ بوجان کا ہے۔جنہیں اس فرقہ واریت نے ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا۔اس اقتباس میں نوسٹلجیا کی کیفیت بدرجہ تم موجود ہے۔انتظار حسین نے تقسیم ہند کے بعد برصغیر کے دونوں ملکوں میں مہاجرین اور شرنارتھیوں کی آبائی ملکیت اور وراثت کے گم ہونے کے ایسے افسوس ناک مناظر پیش کئے ہیں جو عینی مشاہدے پر مبنی ہیں۔مثلاً پاکستان میں اخلاق کے ایک کرائے کے مکان کی اصلیت کیا ہے اس کا پتہ ایک ہندو خاتون کے مکالمے سے لگتا ہے۔وہ خاتون بوجان سے محو گفتگو ہے:

''نہیں میاں،تم جگ جگ اس گھر میں رہو، ہمارا اب اس پہ کیا ادھیکار ہے۔میں تو اپنی لالی کو دکھانے لائی تھی۔بورڈ رکھلا تو میری موسی کے پتر نے آ کے کہا کہ دیدی میں میچ دیکھنے ترے لہور جا رہا ہوں۔میں نے کہا کہ لالے مجھے بھی لے چل۔میں بھی اپنا گھر دیکھ لوں گی لالی کو بھی دکھا لوں گی۔دیکھ تو لے میں نے اسے کہاں جنا تھا۔''(۲۸)

اس اقتباس میں ہندو خاتون کی یاس اور اپنی جڑوں سے بچھڑنے کا کرب دیکھا جا سکتا ہے۔جو دوران ہجرت اسے اپنے گھر اور ملک کو چھوڑنے پر ہوا۔اس طرح کے کتنے ہی ناول ہیں جن میں ناول نگار نے فرقہ واریت کے بعد ہجرت کی المناکی اور کربناکی کو دل سوز انداز میں پیش کیا ہے۔جو اس عظیم تقسیم کے دوران شروع ہوا۔ملکوں کے ساتھ ساتھ دلوں اور رشتوں کا بھی بٹوارہ ہو گیا۔عورتیں گھر سے بے گھر ہو گئیں اور جو کسی طرح اپنی جان اور عزت بچا کر اپنے ملک،اپنی قوم اور اپنوں کے پاس پہنچی تو انہیں کلٹا اور ناپاک کہہ کر ذلیل وخوار کر کے کے دوبارہ اسی نرک کی آگ میں جھونک دیا گیا۔جن میں کچھ نے خودکشی میں ہی اپنی آفیت اور نجات سمجھی،تو وہیں کسی کو باندی یا داسی بنا کر اپنی عیش وعشرت کا سامان بنایا گیا۔کسی کو اپنی وراثت کی یاد ستاتی رہی،تو کوئی اپنے وطن لوٹنے اور بڑے چاؤ ومحبت سے بنائے آشیانے کو پھر سے دیکھنے کا خواب لئے اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئیں۔اس دور کے تقریباً تمام ناول نگاروں نے نہایت عمدگی اور سلیقہ مندی کے ساتھ ان صورتحال کی عکاسی کی ہے جو واقعتاً حقیقت پر مبنی ہے۔

ناول ''تذکرہ''تقسیم ہند کے المیے کے موضوع پر ایک اہم ناول ہے۔اس میں تقسیم ملک کے زیر اثر فرقہ وارانہ ماحول اور قیام پاکستان کے بعد زمیندار مہاجرین کے مسائل کو نہایت ہی دیانت داری کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔بقول ڈاکٹر خالد اشرف:

''انتظار حسین کے یہاں اجتماعی سانحہ ہے جس میں جاگیرداری کا تربیت یافتہ جامد ذہن والا طبقہ اپنی جڑوں سے اکھڑ کر دوسری زمینوں میں آباد ہونے کی حقیقت کی تفہیم میں ناکام ہو چکا ہے۔''(۲۹)

تقسیم ہند کے المیے کے موضوع پر ''آنگن'' خدیجہ مستور کا ایک ناول ہے۔اس ناول کا آغاز تحریک آزادیٔ ہند سے ہوا ہے اور تحریک عدم تعاون کے مناظر کو پیش کرتا ہوا فرقہ وارانہ فسادات، تقسیم ہند اور اعلان آزادی پر ناول ختم ہو جاتا ہے۔ مسلم خاندان کا وہ متوسط طبقہ جس نے جدو جہد آزادی میں اپنی صلاحیت اور جان و مال لٹانے میں کوئی کسر نہیں باقی نہیں رکھی تھی اس ناول کے پلاٹ کا مرکز ہے۔ یہ خاندان اتر پردیش سے تعلق رکھتا ہے۔ پلاٹ کو ماضی اور حال دو حصوں میں رکھا گیا ہے۔'' آنگن کے کرداروں میں عالیہ، بڑے چچا، عالیہ کی والدہ، چھمی، جمیل، نجمہ، کریمن بوا اور اسرار میاں اہمیت کے حامل ہیں۔ عالیہ ناول کی ہیروئن ہے۔ اس میں صداقت اور حق گوئی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔اصول کی پابندی میں اس کا کردار اعلیٰ معیار رکھتا ہے۔ وہ کورانہ تقلید اور فرسودہ خیال کی قائل نہیں۔ ڈاکٹر اسلم آزاد نے ان کرداروں کا تجزیہ کرتے ہوئے بہت صحیح لکھا ہے کہ:

''بڑے چچا کا کردار ایک علامت ہے آزادی کے ان متوالوں اور سورماؤں کی جنہوں نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ جیل گئے، گولیا کھائیں اور تختہ دار ہنستے ہوئے چڑھ گئے۔ بڑے چچا نے بھی اپنی جان نچھاور کر دی اپنے نقطۂ نظر اپنے اصول اپنے وطن پر۔''(۳۰)

ہندوستان کی جنگ آزادی میں ہندو مسلمان دونوں قوموں نے کندھے سے کندھا ملا کر حصہ لیا تھا۔ ان کے سامنے صرف ایک مدعا تھا کہ ملک کی آزادی کے بعد ان کا سیاسی و اقتصادی بحران دور ہو جائے گا۔ مصیبتوں کے بادل چھٹ جائیں گے۔ خوشیوں اور بہاروں کے دن آئیں گے۔ اپنا ملک اور اپنی حکومت ہوگی۔ جس سے ہر فرد بشر خوشحال زندگی گزارنے کا موقع ملے گا۔ استحصال اور تفریق نام کی کوئی چیز نہیں رہے گی۔ اسی مقصد کے تحت دونوں قوموں نے قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں، انگریزوں کی گولیاں کھائیں اور اپنی جانوں کی قربانیاں دیں۔ لیکن ابھی آزادی ملی بھی نہیں تھی کہ فرقہ واریت کے زبردست بھونچال کی چپیٹ میں دونوں قومیں آ گئیں۔ ان حقائق کو پیش کرنے میں خدیجہ مستور کہاں تک کامیاب ہوئیں ہیں

اقتباسات زیریں کی روشنی میں فیصلہ کریں۔ کریمن بوا کے لفظوں میں:

''زمانے زمانے کی بات ہے وہ بھی زمانہ تھا جب ہندو اپنے گاؤں کے مسلمانوں پر آنچ آتے دیکھتے تو سر دھڑ کی بازی لگا دیتے تھے۔ اور مسلمان ہندو کی عزت بچانے کے لئے اپنی جان نچھاور کر دیتا۔ ایسا بھائی چارہ تھا کہ لگتا ایک ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہیں۔ پر اب کیا رہ گیا ہے؟ دونوں کے ہاتھوں میں خنجر آ گیا ہے۔'' (۳۱)

پاکستان ہجرت کر جانے کے بعد مہاجرین شرنارتھیوں کے مکانوں اور ملکیتوں کو ہڑپنے اور قبضہ کرنے پر کوشاں تھے۔ اس سچائی کو خدیجہ مستور نے ''آنگن'' میں بڑی ہنرمندی سے پیش کیا ہے۔ عالیہ اور اس کی والدہ کو اس کے ماموں کے توسط سے جو مکان ملتا ہے اس کا بیان عالیہ کی زبان سے سنئے:

''پانچویں دن ماموں نے ایک چھوٹی سی کوٹھی کا تالا تڑوا کر اماں کو ان کے گھر جانے پر مجبور کیا.....
ایک دن ماموں اکیلے آئے تو انہوں نے بتایا کہ کوٹھی اماں کے نام الاٹ کرا دی ہے۔ اب اسے کسی بھی صورت میں چھوڑنا نہیں۔ پھر انہوں نے فرنیچر اغیرہ کی چند رسیدیں دیں کہ اگر کوئی پوچھے تو یہ دکھا دینا کہ ہم یہاں آ کر سب کچھ خریدا ہے اس کوٹھی میں تو بس کباڑ بھرا تھا۔'' (۳۲)

تقسیم ملک کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کا ایک گروہ جس کا تعلق مسلم لیگ سے تھا، امن و آشتی کی تلاش میں پاستان ہجرت کر جانے پر آمادہ ہوا۔ بربریت اور خونریزی کے ماحول نے اسے اس قدر مبہوت کر ڈالا کہ اپنے آبائی وطن میں خطرے کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ بڑی چچی اور جمیل کے تبادلۂ خیال کی روشنی میں خدیجہ مستور کے مشاہدے ملاحظہ فرمائیں:

''تو کیا سارے مسلمان پاکستان جا کر رہیں گے؟ بڑی چچی نے پوچھا۔ 'واہ اس کی کیا ضرورت پڑے گی جو جہاں ہے وہیں رہے گا'۔ مگر ہندو ہمیں رہنے کیوں نہیں دیں گے وہ نہیں کہیں گے کہ اپنے ملک جاؤ، ان کے ہندو جو ہمارے پاکستان میں ہوں گے ہم ان سے کب کیں گے جاؤ؟'' (۳۳)

ہجرت کے سلسلے بعض وقت ایک ہی خاندان کے افراد کے مابین اختلاف اور انتشار کا ماحول پیدا ہوا۔ نظریاتی تصادم کو اس سے بے حد فروغ حاصل ہوا۔ اس کے المناک اثرات جس شکل میں ملتے ہیں ان کی نشاندہی بھی ناول ''آنگن'' میں کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر بڑے چچا ترک ہجرت کا جواز یوں پیش کرتے ہیں:

''کوئی نہیں جا سکتا، میری اجازت کے بغیر کوئی قدم نہیں نکال سکتا، کس لئے جاؤ گے پاکستان؟ ہمارا ملک ہے ہم نے قربانیاں دی ہیں، اور اب ہم اسے چھوڑ کر چلے جائیں؟ اب تو ہمارے عیش کرنے کا وقت آ رہا ہے۔'' (۳۴)

لیکن عالیہ کی والدہ پر ہجرت کا خبط سوار ہے۔ انہیں اس بات پر یقین ہے کہ ہندوستان ہندوؤں کا ملک بن کر رہ گیا ہے اس لئے وہ اپنے ارادے میں پختہ ثابت ہوتی ہیں۔ اس کے باوجود بڑے چچا کی عالیہ سے بے پناہ شفقت اور اپنے خاندان سے والہانہ محبت نے جب مایوسی کے عالم میں ان سے جملہ کہلوایا۔'' کیا تم سچ مچ جا رہی ہو بیٹی۔'' تو غم والم کی انتہا نہ رہی۔ یہ حقیقت بیانی کی عمدہ مثال ہے۔ پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد کی ہولناکیوں کا تذکرہ خدیجہ مستور نے ان الفاظ میں کیا ہے:

''پاکستان بن گیا۔ لیگی رہنما کراچی دارالحکومت جا چکے تھے۔ پنجاب میں خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ بڑے چچا اس صدمے سے جیسے نڈھال ہو گئے تھے۔ بیٹھک میں بیماروں کی طرح وہ ہر ایک سے پوچھتے رہتے۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ کیا ہو گیا؟ یہ ہندو مسلمان ایک دم ایک دوسرے کے جانی دشمن کیسے ہو گئے؟ یہ انہیں کس نے سکھایا؟ ان کے دل سے کس نے محبت چھین لی؟'' (۳۵)

''زمین'' بھی تقسیم ہند، قیام پاکستان اور مہاجرین کے مسائل کے ماضوع پر خدیجہ مستور کا دوسرا قابل ذکر ناول ہے۔ اس ناول کی وساطت سے انہوں نے اس حقیقت کو پیش کیا ہے کہ ہندوستان کی تقسیم کے بعد مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد امن وآشتی کی تلاش میں اپنے آبائی وطن کو چھوڑ کر نئے ملک پاکستان میں سکونت پزیر ہو جاتی ہے۔ مگر اس کی یہ ہجرت اس کے غموں کا مداوہ نہ بن سکی۔ اس کے لئے ایک طرف اگر حکومت پاکستان کی بے ضابطگی کو ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا ہے تو دوسری جانب خود مہاجرین کو ان کی افراتفری کی بنا پر قصوروار قرار دیا جا سکتا ہے۔ ناول ''زمین'' کے کرداروں میں ناظم، ساجدہ، کاظم، سلیمہ، مالک اور خالہ بی کے علاوہ رمضان اور بوڑھا بابا قابل ذکر ہیں۔ ناظم زیر نظر ناول کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسے سیاست سے خاصی دلچسپی ہے جس کے تحت اس نے کئی مرتبہ قید وبند کی صعوبتیں جھیلی ہیں۔ اس کا آبائی وطن کانپور تھا۔ تقسیم ملک اور قیام پاکستان کے بعد وہ اپنے خاندان کے ساتھ ہجرت کر جاتا ہے۔ پاکستان میں والٹین کیمپ کے محکمۂ بحالیات میں اسے ملازمت مل جاتی ہے۔ لیکن بہت جلد وہ محکمے کی بدنظمی سے بیزار ہو کر اپنی

ملازمت ترک کر کے پاکستان کی سیاسی صورتحال میں تغیر وتبدل لانے کو اپنا مطمح نظر بنا لیتا ہے۔ وہ جمہوریت، انصاف اور مساوات پر مبنی نظام حکومت کا متمنی ہے جب کہ حکومت ایسے خیالات کو بغاوت پر محمول کرتی ہے۔لہٰذا اسے گرفتار کرلیا جاتا ہے۔

ناظم کو مہاجرین سے انتہائی درجے کی انسیت ہے۔محکمۂ بحالیات کی ملازمت کے دوران وہ مہاجروں کو مسنٰی دلانے کی غرض سے یہ یقین دہانی کراتا ہے کہ:

''آپ فکر نہ کریں، ایک دو دن میں آپکو گھر مل جائے گا۔بس ایک تالا توڑا اور آپ کو گھر میں بیٹھایا۔''(۳۶)

ساجدہ جو اس ناول کی ہیروئن ہے، ملک کی تقسیم اور پاکستان کے وجود میں آنے بعد اپنے والد رمضان (جو دہلی میں ایک کپڑے کی دکان میں منشی ہیں) کی معیت میں ہجرت کر جاتی ہے اور لاہور کے والٹن کیمپ میں پناہ گزیں ہوتی ہے۔ والد کی موت کے بعد یہیں سے ناظم اسے اپنے گھر لے آتا ہے۔ کچھ دنوں بعد دونوں رشتہ ازدواج میں منسلک ہو جاتے ہیں۔ والٹن کیمپ میں رہائش کے وقت وہ اپنے ماضی کی خوبصورت اور خوشگوار یادوں میں کھو جاتی ہے۔ ناول نگار نے ساجدہ کے ذریعہ عورتوں کی بے بسی اور مظلومیت کا بہترین نقشہ کھینچا ہے اور دوران ہجرت ان پر ہونے والے ظلم وستم اور ناانصافی و بربریت کو اجاگر کیا ہے۔تقسیم ہند کی ہولناکیوں اور اور فرقہ پرستوں کی بالا دستیوں کو ایک جگہ ساجدہ کی داخلی خود کلامی کے ذریعہ یوں پیش کیا ہے:

''کبھی کبھی وہ (رمضان) بڑے چاؤ سے کہتے تھے، سجو کی ماں کا بنا ہوا محل میں اپنے داماد کے نام کروں گا۔ ہاں! وہ بھی کیا یاد کرے گا، ہماری بٹیا کے پاؤں دھو دھو کر پیئے گا۔اور جب پاکستان بننے کے بعد فساد کی آگ تیز ہوئی اور اپنا محلّہ بھی خالی ہونا شروع ہوا تو بھی ابا گھر چھوڑنے کو راضی نہ تھے۔مگر جب انہیں احساس ہوا کہ گھر پر چھوڑ دس دامادوں کے یلغار ہونے والی ہے تو گھر کے دروازے بھی بند کرنا بھول گئے تھے۔ دہلی میں پناہ گزینوں کے کیمپ میں انہوں نے سر جھکائے جھکائے اپنے محل کا نوحہ پڑھا تھا۔ ماٹی چن چن محل بنایا، لوگ گھر میرا.....''(۳۷)

یہ افسوس ناک صورتحال برصغیر کے دونوں ملکوں میں نمایاں تھی۔ ایسے ہی دہشت انگیز، شور وشغب،

غارت گری اور غاصبانہ ماحول سے متاثر و مظلوم ایک بوڑھے مہاجر کی آہ وفغاں ساجدہ کے کانوں میں سنائی پڑتی ہے۔جس کی جوان بیٹی ہندوستان میں اغوا کر لی گئی ہے۔اس حادثے نے بوڑھے کو پاگل کر دیا ہے۔ اس کی چیخ و پکار نہایت ہی المناک اور رقت انگیز ہے۔اس کی کیفیت ملاحظہ ہو:

''میری بیٹی، میری بیٹی، میری بیٹی کہاں ہے؟ بوڑھا اپنے بال نوچ کر زور زور سے چیخا اور پھر سر جھکا لیا۔چیخنے کے بعد جیسے اسے قرار آجاتا اور پھر گھنٹوں وہ ایک ہی طرح سے جھکائے بیٹھا رہتا۔''(۳۸)

خدیجہ مستور نے اس ناول کے توسط سے اس امر کو سامنے رکھا ہے کہ پاکستان کی تشکیل عمل میں آنے کے بعد حکومت نے مہاجرین کے مکان وملکیتوں کی تباہی و بربادی کے پیش نظر انہیں معاوضہ عنایت کرنے کی غرض سے محکمۂ بحالیات کی تشکیل کی تھی۔لیکن یہاں بھی مہاجرین افراتفری کا شکار تھے۔اس نکتے کی وضاحت ساجدہ کے والد رمضان کے حوالے سے کی گئی ہے۔مثلاً:

''اچھا تو اب آپ تفصیل بتائیں۔آپ وہاں کیا کیا چھوڑ آئے ہیں؟ ارے ناظم صاحب! نہ پوچھئے کہ کیا کیا چھوڑ آیا ہوں۔پانچ کمروں کا مکان، ایک بہت بڑی کپڑے کی دکان، وہاں وہاں دو دو منشی کام کرتے تھے، کیا دن تھے وہ بھی!

.....رمضان صاحب!.....یہ لیجئے کاغذات اپنا نام کلیم لکھئے گا اور دو گواہوں کے دستخط کرا لیجئے گا''.....دو گواہ کا ہی چار گواہوں کے دستخط کرالوں گا۔''(۳۹)

جب کہ رمضان دہلی میں ایک کپڑے کی دکان میں منشی گیری کا کام کرتا تھا۔اس سے ظاہر ہے کہ پاکستان میں پراگندگی، انتشار اور بدعنوانی کا ماحول سازگار بنانے میں مہاجرین نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

الغرض اس ہجرت میں مہاجرین نے صرف اپنے ملک، وراثت، گھر، رشتے ناطے حتّٰی کہ اپنی ماں، بہن، بیٹی کی عزت وحرمت کو بھی کھو دیا۔عورتیں کو کسی جانور کی طرح ناکردہ گناہوں کی سزا کے طور پر قربانی کی صلیب پر چڑھا دیا گیا۔یا ان بے آسرا و بے حرماں کو شادی، داسی یا باندی بنا کر ہمدردی کا نظرانہ پیش کیا گیا۔گویا ایسا کرنا مردوں کی اعلیٰ ظرفی اور عورتوں کی خوش نصیبی میں شمار ہوتی ہے۔الغرض کہ ہندوستان کی اجتماعی زندگی میں تقسیم ہند، فسادات اور ہجرت یا دیسی ریاستوں اور زمین داری کے خاتمے نے ہلچل کر دی تھی۔لیکن یہ تبدیلی اتنی اہم نہیں تھی جتنی اہم وہ تبدیلی تھی جو سماجی، ذہنی اور جذباتی رشتوں کے ٹوٹنے سے

انسان کے دل و دماغ اور سوچ وفکر میں ہوئی تھی جس نے انسان کو ایک نفسیاتی مریض بنا کر رکھ دیا تھا۔ ویسے بھی یہ انسانی فطرت ہے کہ چاہے اسے زندگی کی کتنی ہی مادّی سہولتیں اور آسائشیں میسر ہو جب تک اسے روحانی خوشیاں حاصل نہ ہوں تمام مادّی آسائشیں بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ گو مہاجرین کو ان کی متروکہ جائداد نہ ملنے کی وجہ سے ان کی مالی حیثیت بدل گئی تھی، لیکن جائداد واملاک سے بھی زیادہ قیمتی اثاثہ اپنے پرانے وطن، ساتھیوں اور عزیزوں کی یادیں تھیں۔ یہ مہاجرین کسی کو بے آبرو ہوتے ہوئے کسی کو مرتے، اور کسی کو روتے ہوئے چھوڑ کر آئے تھے۔ یہ تکلیف دہ مناظر ان کے ذہنوں پر نقش ہو چکے تھے جن کو مٹانا ان کے بس میں نہ تھا۔ وہ ساتھی، بہن بھائی اور عزیز جس کے ساتھ انہوں نے زندگی کا بیشتر حصّہ گزارا تھا، وہ یا تو ان سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے تھے اور کچھ بچھڑ گئے تھے۔ بچھڑنے والوں کے متعلق یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ زندہ بھی ہیں یا نہیں، اور اگر زندہ ہیں تو وہ کس حال میں ہوں گے اور کیا وہ کبھی ان سے دوبارہ مل سکیں گی؟ جو بہت تکلیف دہ احساس تھا۔ یہ ایسے سوالات تھے جو انہیں ہمہ وقت بے چین کئے رکھتا تھا اور وہ اپنے بچھڑوں کو کرنے علاوہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ مغویہ اور بازیافتہ خواتین کا مسئلہ اور بھی زیادہ سنگین تھا۔ بہت سے لوگ ایسے تھے جنہوں نے اپنی بیٹیوں کے مرنے کی دعائیں کی تا کہ ان کی عزت محفوظ رہے۔ آہ! کیسی بے بسی و لاچاری تھی۔ بازیافتہ خواتین کے کرب کی تو کوئی انتہا نہ تھی۔ یہ خواتین بہت ہی تکلیف دہ مراحل سے گزرنے کے بعد جب اپنوں سے جا کر ملتیں تو انکے گھر والے انہیں نفرت کی نگاہ سے دیکھتے گویا وہ اپنی مرضی سے بھاگ کر گئی تھیں، اور معصوم و بے گناہ ہونے کے باوجود وہ خود ان کا سامنا کرنے سے کتراتیں۔ اسی نفرت، حقارت اور شرمندگی کے سبب بہت سی عورتوں نے جہاں سے آئی تھیں وہیں رہنا مناسب سمجھا اور بعض نے اپنے مذہب تک کو بدل لیا۔ بہت سے والدین ایسے بھی تھے جنہوں نے اپنے بوجھ اور ذمہ داریوں کو کم کرنے کے لئے اپنے نوکروں تک سے اپنی لاڈلیوں کی شادیاں کیں۔

حواشی

(۱) مضمون بہ عنوان: اردو کے نئے ناول کی نئی دنیا، مشمولہ رسالہ ماہنامہ آجکل، جولائی ۲۰۰۹ء، ص: ۱۵۰

(۲) ڈاکٹر سید عبداللہ، اردو ادب کی ایک صدی، مکتبہ محبان اردو، دہلی، ۱۹۸۹ء، ص: ۲۴۱

(۳) وقار عظیم، داستان سے افسانے تک، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۷ء، ص: ۱۶۲

(۴) Seminar 510, February,2000, New Delhi, p.no.3

(۵) ایضاً، ص: ۷

(۶) قرۃ العین حیدر، میرے بھی صنم خانے، ادارہ یوسف پبلشرز، راولپنڈی، ۱۹۴۷ء، ص: ۴۰۰

(۷) ایضاً، ص: ۴۵۷

(۸) یوسف سرمست، بیسویں صدی میں اردو ناول، ترقی اردو بیورو، دہلی، ۱۹۹۵ء، ص: ۴۷۸

(۹) قرۃ العین حیدر، میرے بھی صنم خانے، ادارہ یوسف پبلشرز، راولپنڈی، ۱۹۴۷ء، ص: ۴۱۷۔۴۱۸

(۱۰) عقیل احمد، اردو ناول اور تقسیم ہند، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۷ء، ص: ۱۱۹

(۱۱) عبداللہ حسین، اداس نسلیں، اردو پبلیشرز، دہلی، ۱۹۸۲ء، ص: ۸۴۰

(۱۲) ایضاً، ص: ۴۴۔۸۴۵

(۱۳) ایضاً، ص: ۲۳۹

(۱۴) عبداللہ حسین، اداس نسلیں، اردو پبلیشرز، دہلی ۱۹۸۲ء، ص: ۸۱۶

(۱۵) ایضاً، ص: ۸۴۳

(۱۶) ایضاً، ص: ۸۴۲

(۱۷) خالدا شرف، برصغیر میں اردو ناول، ادارہ مجلس پیتم پورہ، دہلی، ۱۹۹۴ء، ص: ۲۰۷

(۱۸) قرۃ العین حیدر، سفینۂ غم دل، مکتبہ جدید لا ہور، ۱۹۵۲ء، ص: ۳۰۲

(۱۹) ایضاً، ص: ۳۰۲

(۲۰) ممتاز احمد خاں، اردو ناو لکے بدلتے تناظر، کراچی، ۱۹۹۳ء، ص: ۸۳

(۲۱) قرۃ العین حیدر، آگ کا دریا، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۴ء، ص: ۵۶۴

(۲۲) انتظار حسین بستی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۸۰ء، ص: ۱۳۱

(۲۳) ایضاً، ص: ۸۴

(۲۴) ایضاً،ص۲۱۷

(۲۵) پروفیسرانور پاشا، ہندو پاک میں اردو ناول، پیش رو پبلی کیشنز، دہلی۱۹۹۲ء،ص:۱۳۰

(۲۶) انتظار حسین بستی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۸۰ء،ص:۴۷

(۲۷) انتظار حسین، تذکرہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۸۷ء،ص:۹۰

(۲۸) ایضاً،ص:۲۵

(۲۹) خالد اشرف، برصغیر میں اردو ناول، ادارہ مجلس، پیتم پورہ، دہلی،۱۹۹۴ء،ص:۱۹۵

(۳۰) ڈاکٹر اسلم آزاد، مقدمہ برائے ناول آنگن، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی،۱۹۸۴ء،ص:۹

(۳۱) خدیجہ مستور، آنگن، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی،۱۹۸۴ء،ص:۳۰۴

(۳۲) ایضاً،ص:۳۲۰

(۳۳) ایضاً،ص:۱۳۸

(۳۴) ایضاً،ص:۸

(۳۵) ایضاً،ص:۱۳۷

(۳۶) خدیجہ مستور، زمین، عالیہ بک ہاؤس، دہلی،۱۹۸۴ء،ص:۲۷

(۳۷) ایضاً،ص:۲۳

(۳۸) ایضاً،ص:۱

(۳۹) ایضاً،ص:۲۷

○○○

باب چہارم

تقسیم ہند، فسادات اور ہجرت کا تانیثی مطالعہ

(نمائندہ خاتون ناول نگاروں کے حوالے سے)

- قرۃ العین حیدر
- خدیجہ مستور
- جمیلہ ہاشمی

انسانی تاریخ اور اس کے ارتقا کے سفر کی کہانی مرد یا محض عورت کے وجود سے ممکن نہیں ہوتی۔ سماج کی تشکیل میں عورت اور مرد دونوں برابر کے شریک ہیں۔ دونوں ہی کا وجود ایک دوسرے کی تکمیل اور بقائے بنی نوع انسان کے لئے ناگزیر ہے، لہٰذا دونوں میں سے کسی ایک کی اہمیت سے انکار کرنا بڑی نا انصافی ہے۔ لیکن اگر انسانی ارتقا کی تاریخ کے صفحات الٹ کر دیکھیں تو یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ یہ نا انصافی مردوں سے اکثر سرزد ہوتی آئی ہے۔ مردوں نے عورتوں کے وجود اور اس کی اہمیت کو اگر قبول بھی کیا تو ذاتی مفاد کی خاطر اور جب کبھی انہوں نے عورتوں کے حقوق کی بات بھی کی تو اس کے پس پردہ عموماً عورتوں کا استحصال تھا۔

زمانۂ قدیم سے زمانۂ حال تک عورت کی حیثیت اور مرد کے مقابلے میں اس کی اہمیت کے تعلق سے مختلف عقائد اور رویے کام کرتے نظر آئے ہیں، اور ان ہی کے مطابق سماج میں اس کی اہمیت گھٹتی اور بڑھتی رہی ہے۔ عورت اپنی محبت، خدمت، ہمدردی اور ایثار و قربانی کی بدولت مردوں کے دلوں میں باعزت مقام رکھتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ عورت کے استحصال اور غلامی کی ذمہ داری اسی سماجی نظام کے سر ہے جو منافع، لوٹ اور استحصال پر مبنی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک زمانہ تھا جب عورت خاندان کی سردار سمجھی جاتی تھی۔ سلسلۂ نسب ماں کے نام پر چلتا تھا۔ بچے ماں کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ یہ مادری سماج اب بھی بعض قبایل میں قائم ہے۔ اس میں سبھی محنت میں شریک ہوتے تھے، اور محنت کی پیداوار سب میں یکساں تقسیم کر دی جاتی تھی۔ جب ذاتی ملکیت کا قصہ شروع ہوا تو وراثت کا مسئلہ اٹھا اور وراثت کے مسئلے کو طے کرنے کیلئے واحد اور صحیح وارث کی تلاش ہوئی۔ اسی کی بناء پر شادی اور خاندان کے ادارے وجود میں آئے اور مادری کی جگہ پدری نظام قائم ہوا جس نے آہستہ آہستہ عورت کو جلیس اور شریک حیات کے بجائے جائداد اور ملکیت قرار دے دیا، اور وارث پیدا کرنے کا وسیلہ سمجھ لیا۔ نیز اسے اس حال پر راضی رہنے کے لئے مختلف حربے استعمال کئے گئے۔ کہیں اسے ستی، سیتا اور ساوتری کا آدرش مان کر اسے پوجا، تو کبھی آسمانی

اپسرا کا روپ دیا گیا، کبھی شاعروں اور فنکاروں نے عشق وہوس کی نظر سے اسے دیکھا، چاہا اور سوچا۔ کبھی اسے گھنگھروؤں کی جھنکار میں دیکھا اور سنا گیا تو کبھی اسے دروپدی کی شکل دی گئی۔ کبھی شوہر کو اس کا مجازی خدا قرار دیا گیا جس کی اطاعت اور فرمانبرداری اس فرض ٹھہرا اور مرنے کے بعد اس کے ساتھ ہی ستی ہو جانا اس کا مقدر۔ ماں بنی تو اسے ایثار کا نمونہ قرار دیا گیا۔ بیوی کی حیثیت سے گریہہ لکشمی اور اور گھر کی رانی بنا کر اسے باقی دنیا سے کاٹ دیا گیا۔ بیٹی بنی تو اس کا کام والدین کی خدمت اور بھائیوں پر جان نچھاور کرنا ٹھہرا اور جب بات حفاظت کی آئی تو وہ بھائیوں کی کلائیوں میں راکھیاں باندھتی رہی۔ غرض کہ وہ ایسی قیدی تھی جس کے لئے سونے چاندی کے زیوروں کی زنجیریں تھیں۔ جہیز کی خاطر جلائی اور جھلسائی جانے لگیں۔ اس کا مقدر بکاؤ مال اور سامان تفریح بننا تھا۔ وہ یا تو وسیلۂ تفریح تھی یا گھر بار کے انتظام اور افزائش خاندان کا وسیلہ ٹھہریں۔ اس کی پوری شخصیت محض اضافی تھی جس کی معاشرے اور خود انسانی زندگی میں کوئی وقعت نہیں۔ وہ صرف مرد کی وساطت سے جانی و پہچانی جاسکتی تھی۔ اس کی اپنی کوئی شخصیت، انفرادیت اور زندگی نہ تھی۔ وہ محض ناموس خاندان تھی۔ کسی کی ملکیت اور چاہے جانی والی چیز۔ جاگیرداری اور سرمایہ داری میں وہ ملکیت اور نظام معیشت کا رنگین ضمیمہ بن کر رہ گئی۔ سرمایہ داری نے اسے مساوات کے نام پر مشین بنا دیا یا آلۂ تفریح۔ سرمایہ داری نظام کے پاس عشق و عاشقی کی لمبی کورٹ شپ کے لئے وقت نہ تھا۔ لہٰذا اس نے طوائف کی جگہ کارل گرل کا ادارہ ایجاد کیا اور عورت کو تفریحی سامان ہی نہیں تفریحی سامان کے اشتہار کے لئے برتنا اور بیچنا شروع کر دیا۔ اس طرح عورت زیادہ شاطر، زیادہ سجیلی، بھڑکیلی اور نظر فریب بن گئی اور انسانی رشتوں کے درمیان کی گرمی، خلوص، تقدس اور نرمی آہستہ آہستہ زائل ہونے لگی۔ جوں جوں سماج ارتقائی منزلیں طے کرتا گیا، مرد اپنی جسمانی قوت کی وجہ سے حاکمانہ رویہ اپنا کر عورتوں پر قابض ہوتا گیا۔

بقول اگست بیبل:

> ''بہت سارے ممالک میں اور مختلف ادوار میں اس سوال پر سنجیدگی سے غور کیا گیا ہے کہ آیا عورتیں بھی انسان (Human being) ہیں یا نہیں اور کیا ان کے اندر بھی روح ہے؟''(۱)
>
> ''قدیم دور میں عورت کی حیثیت انتہائی درجہ کے استبداد سے دوچار تھی۔ اسے جسمانی طور پر مغلوب کر کے قبضے میں رکھا جاتا اور ذہنی طور پر اس سے بھی زیادہ ظلم روا رکھا جاتا تھا۔ خانگی

معاملات میں اس کی حیثیت نوکروں سے صرف ایک درجہ بہتر تھی۔اس کے اپنے بیٹے اس کے آقا ہوتے تھے،جن کی فرمانبرداری اس پر لازم تھی۔''(۲)

چین کی ایک مہذب خاتون عورتوں کے متعلق اپنی رائے کا یوں اظہار کرتی ہیں کہ:

ہم عورتوں کا مقام انسانیت کا سب سے گرا ہوا مقام ہے۔اسلئے ہمارے حصے میں سب سے حقیر کام آئے ہیں..... عورت کس قدر بدنصیب ہے۔پوری دنیا میں کوئی چیز اس سے زیادہ بے قیمت نہیں۔''(۳)

روم جیسی مہذب ترین ملک میں عورت کو کسی طرح کا کوئی انسانی اور قانونی حق حاصل نہیں تھا۔

'' وہ کسی چیز کی مالک نہیں ہوسکتی تھی۔اور بعض حالات میں تو شوہر اپنی بیوی کو قتل کر سکتا تھا۔''(۴)

روس کے معاشرتی نظام کے مطابق:

''بیوی کو زدوکوب کرنے کے لئے شادی کے وقت خسر کی طرف سے ایک کوڑا بھی دیا جاتا تھا۔یہ رسم روس میں زار کی سلطنت کے آخر تک رائج تھی۔''(۵)

مفکرین کے خیالات بھی عورت کے متعلق اچھے نہیں تھے۔ان لوگوں نے بھی عورت کو حقیر اور کمتر سمجھا۔ان عبارتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ عورت کس قدر حقیر اور ذلیل سمجھی جاتی تھی۔انہیں ''انسان'' کے زمرے میں بھی رکھنا گوارا نہ تھا اور اگر چوں چرا کے بعد گوارا بھی ہوا تو اس شرط پر کہ عورت کی حیثیت ایک خودمختار ذی روح کی نہیں، بلکہ ایک ایسی بے جان شئے کی سی ہے جس کے ساتھ مرد جیسا چاہے، ویسا سلوک ختیار کرے۔اس کی سماجی حیثیت بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ دیگر گوں ہوتی چلی گئی۔دنیا کی مختلف ممالک میں مثلاً یونان، انگلستان، مصر، روم، عرب وغیرہ میں عورت کی پستی اور کمتری کی ایک طویل داستان دیکھنے کو ملتی ہے۔کسی بھی جگہ اسے وہ رتبہ اور مقام نہیں ملا جو مردوں کو شروع سے ہی حاصل رہا تھا۔

بات شاعری کی ہو یا فکشن کی عورت کا تصور وقت کے ساتھ بدلتا رہا ہے۔اردو شاعری میں عورت محبوبہ، طوائف، ماں، بیوی، بیٹی، نرس، دوست، ملازم کے کردار میں تو نظر آتی ہے۔فکشن میں بھی اس نے مختلف روپ اختیار کئے ہیں۔عورت کا حسین ہونا شرط ہے کیوں کہ ادب کا موضوع عورت نہیں حسین عورت

ہے۔اردو کے ابتدائی داستانوں ، ناولوں اور شاعری میں صرف پری جمال اور خوبصورت عورتیں نظر آتی ہیں یا پھر جادوگر چڑیلیں۔لیلیٰ ،شیریں،کلوپیٹرا،سوہنی اور ہیریہ ہمارے ابتدائی افسانوی ادب کی ہیروئینیں تھیں۔ایثار و وفاداری کی زندہ مثال۔اس رویایت سے انھر اف کرنے والے ڈپٹی نذیر احمد تھے۔انہوں نے پہلی بار عورت کے ایسے کردار پیش کئے جو حقیقت سے قریب تھے۔انہوں نے عورت کو حسن و شباب کا ذکر کئے بغیر ، اچھی یا بری عورت کے روپ میں دکھایا۔ بیسویں صدی کی دوسری یا تیسری دہائیوں میں ہندوستان میں سیاسی وتہذیبی تبدیلیاں تیز ہوگئیں۔آزادی کی تحریک، ملک کی تقسیم،تقسیم کے نتیجے میں عالمگیر پیمانے پر فرقہ وارانہ فسادات اور ہجرت ،روس کا انقلاب، آزادی کی جدوجہد میں انقلابی جوش وخروش، جاگیرداری سماج کی ٹوٹری ہوئی قدروں نے ادب پر رومانویت کے ڈالے ہوئے پردے اٹھا دئے۔نذیر احمد کی اصغری سے لیکر قرۃ العین کی چمپا، دیپالی سرکار جمیلہ ہاشمی کی کنول کمار ٹھا، خدیجہ مستور کی عالیہ تک اور دور حاضر کے نئے نسوانی کردار تک بہت کچھ بدل گیا ہے۔عورت کے اس بدلتے ہوئے روپ کو فکشن نگاروں نے اپنی تخلیقات کا نہ صرف موضوع بنایا ہے بلکہ ان کے جذبات واحساسات، افکار وخیالات کی ہر عہد میں حقیقی ترجمانی کی ہے اور معاشرے میں ان کے حقوق اور تشخص کو بحال کرانے میں نمایاں کردار بھی ادا کیا ہے۔وقت گزرتا گیا اور تقسیم ہند کا سانحہ ظہور پزیر ہوا۔اور دنیا کے نقشے پر ایک نئے ملک کا آغاز ہوا۔ دونوں ممالک میں سیاسی اور تہذیبی سطح پر زبردست افراتفری کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ نئے نئے مسائل، نئے واقعات اور نئی تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ ادب بھی اس کشاکش کا شکار ہوا اور متعدد ناول تصنیف کئے گئے۔ادیبوں نے جہاں مختلف صنف سخن کو اپنا کر تقسیم ہند کے سانحہ کو قلمبند کیا وہیں ناول کے میدان میں بھی اپنے قلم کی جولانیاں دکھائیں اور کئی شاہکار ناول لکھ کر نہ صرف معیار فن کو بلند کیا بلکہ حقیقت کے تلخ تجربات ،سماجی شعور،عصری آگہی اور معاشرتی زندگی کی بے مثال آئینہ داری کی۔اس کے ساتھ ہی فسادات،ہجرت،اقدار کا بحران،نئی اقتصادی اور نفسیاتی تبدیلیاں،نئی تہذیبی مسائل اور سماج کی تشکیل نو کی تقریباً سبھی سطحوں کو اپنے ناولوں میں پیش کیا۔اس سلسلے میں خواتین ناول نگار بھی مرد ناول نگار سے پیچھے نہیں رہیں۔خواتین ناول نگاروں نے بھی اپنی تخلیقی قوتوں کے ذریعے مزکورہ مسائل کو اپنے ناولوں اسی عمدگی اور سچائی کے ساتھ پیش کی پوری کوشش کی ہے۔ان خواتین ناول نگاروں میں قرۃ العین حیدر، خدیجہ مستور اور

جمیلہ ہاشمی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ان سبھی خواتین ناول نگاروں نے برصغیر کے تمام مسائل بالخصوص تقسیم ہند کے سانحہ کے نتیجے میں عورتوں پر ہورہے ظلم وزیادتی، ذہنی کرب، استحصال، جبروتشدد کو حقیقی پیرائے میں پیش کیا ہے۔اوران سب کے درمیان انہیں عورتوں کو جبروتشدد کے خلاف آواز بلند کرنے والی جنگ آزادی میں مردوں کے شانہ بہ شانہ چلنے والی عورتوں کے ایک خاص روپ کو آہستگی اور شائستگی کے ساتھ اجاگر کیا ہے۔اس کے علاوہ مہاجرین کی نفسیاتی شکست وریخت، ہجرت کا کرب اور اپنی جڑوں سے اکھڑنے کی دائمی تکالیف کے احساسات، عورتوں کا سماجی رتبہ اور بہ حیثیت عورت ان کے تمام مسائل کو موضوعاتی نقطہ نظر سے پیش کیا ہے۔ نئے سماج میں عورتوں کی سماجی اہمیت، عورتوں کے مختلف طبقات ان کی معاشی الجھنیں اوراعلیٰ وادنیٰ طبقوں سے تعلق رکھنے والی خواتین کی طرز معاشرت اوران کی روایتی اور جدید زندگی کا عکس ان کے ناولوں میں دکھائی دیتا ہے۔

خواتین ناول نگار میں ''قرۃ العین حیدر'' اور ''جیلانی بانو'' کے ناولوں میں تقریباً تمام مسائل ملتے ہیں۔ان کے ناولوں میں تقسیم ہند موضوع کی شکل میں ابھرتی ہے۔اس سلسلے میں قرۃ العین حیدر کی بیش تر ناول تقسیم ہند، فسادات اور ہجرت کی تمام ہولناکیوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔''میرے بھی صنم خانے''، ''سفینۂ غم دل''، ''آگ کا دریا''، ''آخر شب کے ہمسفر''، ''کار جہاں دراز ہے''۔ان سبھی ناولوں میں تقسیم کا المیہ انسانی حادثہ کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔خود قرۃ العین حیدر تقسیم ہند کے المناک حادثہ سے بے حد متاثر تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تقریباً سبھی ناولوں میں اس المناک حادثہ کی سسکتی ہوئی آواز سنائی دیتی ہے۔قرۃ العین حیدر نے اپنے ایک مضمون میں رقمطراز ہیں:

> ''۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی تقسیم عمل میں آئی۔ والد کے انتقال کے بعد یہ میرے لئے دوسرا زبردست ذہنی اور جذباتی حادثہ تھا۔ میں نے افسانے ۱۹۴۴ء سے لکھنا شروع کردئے تھے۔تقسیم ہند کے صدمے نے ۱۹۴۷ء کے آخر میں ساڑھے انیس سال کی عمر میں مجھ سے ''میرے بھی صنم خانے'' لکھوایا۔ جو میرا پہلا ناول تھا اور جسے آج ننھی اردو کے چند اچھے ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔اس کے بعد جو کچھ بھی میں نے لکھا اس صدمے کے زیر اثر لکھا۔''(۶)

اس طرح تقسیم ہند کے سانحہ نے قرۃ العین حیدر کو نہ صرف ذہنی اور جذباتی صدمہ پہنچایا تھا بلکہ ان

کے پورے وجود کو جھنجھوڑ ڈالا تھا۔قرۃ العین حیدران تمام انسانی قدروں کی پامالی اور مشترکہ تہذیب کی تباہی سے لرز اٹھیں جو انہیں بے حد عزیز تھی۔یہی وجہ ہے کہ انسانی اقدار و معیار اور مشترکہ تہذیب کی یاد کی کسک ان کے تخلیقی فن پاروں میں اکثر جگہ نمایاں نظر آتی ہے۔

قرۃ العین حیدر کا پہلا ناول ''میرے بھی صنم خانے'' اردو کے چند اہم ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ ناول فنی لوازمات کے ساتھ ساتھ تکنیک کی نئی راہوں سے ہوتا ہوا ناول کے نگار خانے میں آتا ہے۔اس میں نہ صرف اودھ کا مشترکہ تہذیب وتمدن دم توڑتا ہوا دکھائی دیتا ہے بلکہ آزادی کا جذبہ، جدوجہد اور عمل پیہم کے ساتھ فرقہ پرستی اور طبقاتی کشمکش کا احساس بھی نمایاں ہے۔طبقہ نسواں کی ناول نگاری میں قرۃ العین حیدر نے میرے بھی صنم خانے میں پہلی بار شعور کی رو کی تکنیک کا استعمال کیا ہے۔اقبال کی ایک رباعی سے لیا گیا تین لفظ تراشیدم، پرستیدم، شکستم اور میر انیس کا ایک شعر۔

انیس دم بھر کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

موضوع اور اس کی معنویت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔اقبال اور انیس سے اخذ کئے گئے الفاظ اور شعر فارسی کے دماغ میں جو تاثر ابھرتا ہے وہ یہ ہے کہ صنم خانے کے صنم بہرحال فانی ہیں۔ چونکہ صنم کو تراش کر انسان نے ہی اس کو معنویت بخشی۔پھر اس کی پرستش کیا اور پھر ان مرحلوں سے گزر کر شکستگی کے دو راہے پر پہنچ گیا۔ یہ صنم خانے تہذیب تمدن اور ثقافت واخلاق کے اقدار بھی ہو سکتے ہیں اور برطانوی حکمرانوں کے ظلم وتشدد اور جبر وستم سے حصول آزادی کے مظہر بھی۔ کیونکہ اس زمانے میں بلاتفریق مذہب و ملت پر انسان کا واحد مقصد آزادی حاصل کرنا تھا۔اور جب غلامی کی زنجیریں ٹوٹیں اور ہندوستان آزادی کی فضا میں سانس لی تو کس طرح سے مشترکہ کلچر اور ہندو مسلم بھائی چارے کے جذبات مجروح ہوئے۔ ملک کے گوشے گوشے سے خاک وخون کا سمندر بہہ نکلا اور اس صنم خانے کے ایک ایک بت کو مسمار کر ڈالا گیا۔اس ناول کا موضوع تقسیم ہند اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل ہیں۔جس میں قرۃ العین حیدر نے انسان کی زندگی کو المناک حادثہ کے طور پر پیش کیا ہے۔خود قرۃ العین حیدر نے اس ناول کے متعلق کہا ہے کہ'' میرے بھی صنم خانے'' ایک عظیم انسانی ٹریجڈی کی داستان ہے۔اور یہ ٹریجڈی ہندوستان کی صورت میں

رونما ہوتی ہے۔جس کے سبب سینکڑوں کا ندان اور لاکھوں افراد کو خون سے لت پت اور تہہ تیغ کیا گیا اور ایک ایسی تہذیب اور ثقافتی ورثہ کو پامال کر دیا گیا۔ جو صدیوں سے چلا آ رہا باہمی اتحاد اور ہندو مسلم بھائی چارے سے وجود میں آیا تھا۔تہذیب اور ثقافتی ورثہ کی تباہی اور پامالی کے خلاف ''میرے بھی صنم خانے'' میں سخت احتجاج ملتا ہے۔جس کو قرۃ العین حیدر نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> ''ارے تم نے فوجیں، سرکاری محکمے، توپیں، مشین گنیں اور ہتھیار تو تقسیم کر لئے۔لیکن ہمارے اس مشترکہ تمدن، ہماری اس موسیقی، ہمارے ادب، ہمارے آرٹ کا کیا ہوگا۔کیا تم یہ کہو گے یہ ہندو موسیقی ہے۔ یہ مسلم موسیقی ہے۔ یہ خالص اس ڈومینین کا آرٹ ہے۔یہ صرف اس ملک کا آرٹ ہے۔کوکل اور بچن اور نرالا صرف ہندوؤں کے لئے ہیں۔ نذرالاسلام اور جوش فقط مسلمانوں کے لئے ہیں''۔(۷)

قرۃ العین حیدر نے اس ناول میں اودھ کی مٹتی ہوئی تہذیب کی تصویر اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے۔جس سے وہاں کی ثقافتی اور تہذیبی زندگی آئینے کی طرح نمایاں ہو جاتی ہے۔میاں شعر وسخن کی محفلیں گرم ہوتی ہیں۔گومتی کا دلکش کنارا اور اس کا بانکپن ہوتا ہے۔آم اور امرود کے باغیچے بھی اپنی چھب خوب دکھلاتے ہیں۔ یہ ناول دوسری جنگ عظیم سے شروع ہو کر تقسیم ہند پر آ کر ختم ہو جاتا ہے۔اس عہد کے سماجی اور سیاسی حالات کرداروں کو بے حد متاثر کرنے سے تقریباً سبھی کردار ذہنی الجھنوں میں گرفتار رہتے ہیں۔ رخشندہ خود ترقی پسندی کی علمبردار رہتی ہے۔اور سماج کی جمودی کیفیت کو ختم کر کے نہ صرف نئی تبدیلیاں لانے کی خواہاں ہے بلکہ سماج میں پنپ رہی بے فرسودہ رسم ورواج اور دقیانوسی رویے سے برسر پیکار بھی نظر آتی ہے۔وہ ملک کے بدلتے ہوئے حالات کا جائزہ اخباروں یا سنی سنائی خبروں سے لیتی ہے۔ پی چو جو پولیس آفیسر ہونے کے ساتھ ساتھ رخشندہ کا بڑا بھائی بھی ہے۔ جب پی چو اپنا دورہ ختم کر کے آتا ہے تو رخشندہ اس سے معلوم کرتی ہے:

> ''پی چو تم تو اس وقت صوبے کا بڑا حصہ دیکھ کر آ رہے ہو۔تم نے کچھ محسوس کیا؟ لوگ کیا کر رہے ہیں کس طرف جا رہے ہیں؟
>
> تو وہ جواب دیتا ہے۔
>
> ''روشی کچھ سمجھ نہیں آتا۔سب کے سب کیوں بھیڑ چال آنکھیں بند کئے اندھا دھند ایک سمت کو بھاگے جا رہے ہیں۔''(۸)

رخشندہ ناول کا مرکزی کردار ہے اور ناول کی پوری کہانی پر چھائی رہتی ہے۔قرۃ العین حیدر نے جاگیردارانہ طبقے کی خوشحالی اور اس طبقے کی بدحالی اور زوال پزیری کے ایسے نقوش ابھارے ہیں جن کے پیچھے جاگیردارانہ نظام اور خاندان کی روایتی رسم ورواج دم توڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔اس کے علاوہ طبقاتی رویوں کی پیش کش بھی ملتی ہے ۔ جہاں جاگیردارانہ شان وشوکت کے ساتھ خاندانوں میں نئ اور پرانی قدروں میں کشمکش اور تصادم بھی نمایاں ہے۔ناول تین ابواب پر مشتمل ہے۔پہلا باب ''چلی جائے موری نیا کنارے کنارے'' دوسرا باب ''دھنستے ہوئے ساحل'' اور تیسرا ''منزل لیلیٰ'' جیسے عنوانات سے شروع ہوتا ہے۔ان ابواب میں ایک ربط اور ہم آہنگی ہے۔وہ نیا جو کنارے کنارے جارہی ہے جب ساحل کے قریب پہنچتی ہے تو سامنے دھنستے ہوئے ساحل ہوتے ہیں اور جب ان دھنستے ہوئے ساحل کی اذیت اور دشواریوں سے نکل کر منزل لیلیٰ (آزادی وطن کا خواب) نظر آتی ہے تو وہ شکستہ اور بوسیدہ چونکہ دھنستے ہوئے ساحلوں سے سفر شروع کیا تھا اسلئے منزل لیلیٰ انتہائی انسانیت شکن اور المناک ثابت ہوئی۔قرۃ العین حیدر نے تہذیبی زوال کو پورے درد وکرب کے ساتھ پیش کیا ہے۔اس ناول کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''تہذیب کے مرکزوں اور گہواروں میں پلنے والے دربدر کی ٹھوکریں کھانے کے لئے صحراؤں کی طرف نکل گئے۔امام باڑے ویران اور مسجدیں شکستہ ہوگئیں۔ پرانے خاندان مٹ گئے، زندگی کی پرانی قدریں خون اور نفرت کے آندھیوں کی بھینٹ چڑھ گئی۔ایک عالم تہہ وبالا ہوگیا۔ وہ تہذیب ہندوؤں اور مسلمانوں کا، وہ معاشرتی اور تمدنی اتحاد، وہ روایات، وہ زمانے سب کچھ ختم ہوگیا۔''(۹)

ناول کا آغاز اودھ کے جاگیردارانہ ماحول سے ہوا ہے۔مصنفہ نے اس ناول میں دوسرے ناولوں کی طرح اودھ کی مٹتی ہوئی تہذیب کی تصویر کشی کی ہے۔جس میں فسادات سے قبل جیتا جاگتا لکھنؤ اور یہاں کے ہنستے کھیلتے افراد بھی نظر آتے ہیں۔اور جب فسادات شروع ہوجاتے ہیں تو اس وقت مصنفہ نے آنے والے وقت کے ہاتھوں میں انسانیت کی تباہی کو درج ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے:

> ''پھر وقت کی پرواز کے ساتھ کوئی نیا معمہ بن جائے گا۔کوئی نیا حل تلاش کرلیا جائے گا۔ہم جہاں ہیں اس جگہ نہ ہوں گے۔ یہ سمے آگے نکل جائے گا، زندہ رہنے کی، خوش رہنے کی خواہش، زندگی کی مقناطیسی رو وقت کے ریگستانوں میں کھو جائے گی۔ یہ چھوٹے چھوٹے معصوم بے بس انسان

آنے والے دن آنے والی راتیں سب کے لئے کیا لائیں گی ان کی آنکھیں ابھی کیا کیا دیکھیں گی۔ان کے دل دھڑکیں گے کوئی نہیں جانتا یہ سب کیوں ہے۔''(۱۰)

کہانی کا محور کرواہاراج اور اس تعلقہ دار کنور عرفان علی خان ہیں۔ جاگیردارانہ رکھ رکھاؤ کے تحت لکھنؤ میں ان کی اقامت کے طور پر ایک حویلی ہے جو''غفران منزل'' کے نام سے معروف ہے۔کنور عرفان علی دیگر رؤسا کی طرح فارسی کتب کا مطالعہ کرتے ہیں۔اور آئی،سی ایس افسران کے ساتھ شطرنج کھیلتے ہیں۔ زمانہ تبدیل ہو رہا تھا کانگریس اور بائیں بازو کی پارٹیوں نے مل کر جاگیرداری کو مٹانے اور ان کی املاک کو غریب عوام میں تقسیم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔تقسیم ہند اور آزادی کے بعد وفاقی نظام کے تحت جاگیر کے انضمام کے آثار نے کنور عرفان علی خان کو بے حد مغموم کر دیا تھا۔ چنانچہ ایک دن اسی غم میں''قانون شیخ'' پڑھتے ہوئے ابدی نیند سو گئے۔کنور رانی سلطنت آرا بیگم ان کی اہلیہ ہیں جو کنور صاحب کی موت کے بعد اپنے ایک رشتہ دار چودھری شمیم سے نکاح کر کے سندیلہ چلی جاتی ہیں۔لالہ اقبال نرائن کرواہاراج کا منیجر ہے اور عباس خانم غفران منزل کی مغلانی ہے پولو کنور عرفان علی کا بڑا بیٹا ہے جو کابل راج کمار کی نمائندگی کرتا ہے۔چھوٹا بیٹا جو تعلیم سے فراغت کے بعد مقابلہ جاتی امتحان کے ذریعہ پالیس افسر کے عہدے پر فائز ہوتا ہے۔اور اپنی غیر جانبدارانہ کدمات کی بدولت انڈین یونین کے وفادار ملازم کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔تقسیم ہند اور فسادات کی ہولنا کیوں کے وقت شرنارتھیوں کی حفاظت کے سلسلے میں پی اپنی جان کی بازی لگا دیتا ہے۔لیکن اس مخلصانہ کوشش کے باوجود بھی اسے'ہندوستانی پولیس کا مسلمان افسر کے بننے کے جرم میں قتل کر دیا جاتا ہے۔

رخشندہ کنور عرفان علی کی اکلوتی بیٹی اور ناول کا مرکزی کردار کے طور پر سامنے آتی ہے۔ وہ مغربی تعلیم کی زیور سے آراستہ ہونے کے علاوہ فنون جدیدہ پر بھی مہارت رکھتی ہے۔ چنانچہ میوزک ڈانس اس کے پسندیدہ مشاغل تھے۔ رخشندہ کو اپنے والد کی جانب سے مکمل آزادی حاصل تھی۔قرۃ العین حید نے رخشندہ کے کردار کے نقوش کو اس طرح اجاگر کیا ہے:

''انہوں نے رخشندہ کو مکمل آزادی دے رکھی تھی۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ وہ اس کا غلط استعمال نہیں کرے گی۔اس نے میرس کالج میں پانچ سال کا کورس ختم کر کے بیچلر آف میوزک کی ڈگری

لی تھی۔اس نے الموڑہ کے کلچر سینٹر میں رقص سیکھا تھا۔ وہ اپنے دونوں بھائیوں کے ساتھ دلکشا کلب جا کر انگریزی ناچ میں شامل ہوتی تھی وہ پی چو کی کار یا اپنی سائیکل پر جب چاہے اور جہاں چاہتی آ جا سکتی تھی۔ اس کے ان گنت دوست تھے اور وہ سوسائٹی میں بے حد دلعزیز تھی۔''(۱۱)

رخشندہ ترقی پسند ہونے کے علاوہ سیاست میں بھی دلچسپی لیتی ہے جس کے تحت اس نے ''نیوایرا'' نام کا انگریزی رسالہ نکال رکھا ہے جو کانگریس کے سیاسی نظریوں کا ترجمان ہے۔ چونکہ روشی متحدہ ہندوستان کی دلدادہ ہے۔لہٰذا اپنے نظریے کی وقالت متذکرہ رسالے میں شعلہ ریز مضامین لکھ کر کرتی ہے۔رخشندہ کو اپنے ملک ہندوستان سے اس قدر محبت ہے کہ اس کی بقائے دوام کے لئے رسالے کی پالیسی میں ذرہ برابر تبدیلی کو بھی گوارہ نہیں کرتی۔ذیل کے عبارت اس کے اصول پرستی اور وطن دوستی کی غمازی کرتی ہیں:

''لیکن روشی ہمیں 'نیوایرا' کی پالیسی میں تھوڑی سی تبدیلی کرنی پڑے گی۔میاں کی خاطر اور کرواہا راج کی خاطر..... کیا کہہ رہے ہو پی چو..... 'نیو ایرا' کی پالیسی میں تبدیلی .....؟ رخشندہ نے آنکھیں پوری طرح کھول کر کہا۔''(۱۲)

اس اختلاف کے باوجود اسے اپنے بھائی سے بے حد و بے حساب محبت ہے۔ چنانچہ فسادات کی گہما گہمی کے وقت روشی پی چو کے قتل کی خبر کی تصدیق کے لئے دہلی روانہ ہو جاتی ہے اور کرفیو کے سناٹے میں بھی پالیس چھاؤنیوں اور فوجی کیمپوں کو چھان مارتی ہے۔آخر کار قتل کی خبر صحیح پا کر اپنی حویلی غفران منزل کا رخ کرتی ہے۔ جب وہ لکھنؤ واپس آتی ہے تو قدیم لکھنؤ اجڑ چکا تھا۔اب حویلی پر حکومت کی حکمرانی ہے۔ عرفان علی کی غفران منزل کو اسپتال میں تبدیل کر دیا جو کہ اپنے زمانے میں لکھنؤ میں دو چار منزلوں میں سے ایک منزل تھی۔اس غفران منزل کا ذکر عباسی خانم یوں کیا کرتی تھیں۔زمانے کے ساتھ ساتھ غفران منزل میں بھی تبدیلی آتی رہی ہے۔

''ہائے وہ بھی کیا زمانے تھے جو گزر گئے۔عباسی خانم کہا کرتیں۔ جب غفران منزل غفران منزل تھی.....ہائے کیا شاندار لوگ تھے، کیا محبتیں، کیا وضع داریاں تھیں۔ایک زمانہ وہ بھی عباسی کانم نے دیکھا تھا اور اب یہ دیکھتی ہیں کہ باہر خاک اڑتی ہے۔گھوڑوں کی سفید جوڑیوں اور بگھیوں کی جگہ ایک حماقت زدہ سی موٹر یا برساتی میں کھڑی ہے.....روشنی بیٹا بالوں

کی مینڈھیاں گوندھنے کی بجائے دوپٹہ اڑاتی سائیکل پر بیٹھ یہ جا وہ جا کہاں گئی ہیں کہ بھئی ٹینس کھیلنے جارہی ہیں۔'' (۱۳)

خشندہ کنور عرفان علی کی بیٹی ہے جس نے اپنی زندگی عیش وآرام سے گزاری ہے لیکن تقسیم کے المیے نے نہ صرف اس کے خاندان کو مٹایا بلکہ پوری دنیا کو تباہ کر دیا۔ سب کچھ لٹ جانے کے بعد اسے اپنے چاروں طرف سوائے تنہائی کے کچھ اور نظر نہیں آتا۔ رخشندہ صوفے پر بیٹھی اپنے ہاتھوں پر چہرہ رکھے ''سارا دن گزر گیا'' گنگنا رہی ہے۔ ان الفاظ میں اس کے خاندان کی بربادی بھی نظر آتی ہے۔ مندرجہ بالا اقتباس ناول کے اختتامیہ صفحات پر درج ہیں جس میں قرۃ العین حیدر نے چند قدیم اشیاء کو بطور علامت پیش کیا ہے:

''کرواہاراج کی رخشندہ آتشدان کے پاس ایک پرانے سرخ رنگ کے میلے صوفے پر، جس کے ٹوٹے ہوئے اسپرنگ نیچے کو دھنس گئے تھے، اپنے ہاتھوں پر چہرہ رکھے بیٹھی اور پلکیں جھپکاتی رہی۔
''سارا دن گزر گیا'' اس نے پھر دہرایا۔ دریچے کے باہر ہوائیں زرد پتوں کو ادھر سے ادھر اڑاتی رہیں.....
سارا دن گزر گیا، کوئی نہیں آیا، کوئی.....
کرواہاراج کی رخشندہ نے پھر اپنے آپ سے دہرایا۔
باہر بارش شروع ہو چکی تھی۔'' (۱۴)

اب زمانہ بدل چکا تھا، ہر سو آزادی کا چرچہ تھا اجنبی چہرے، شرنارتھی تھے۔ ساری محفل اجڑ گئی تھی۔ غفران منزل ایک سرکاری عمارت میں تبدیل ہوگئی تھی چنانچہ غفران منزل میں تعینات دفتر کا سنتری اسے روک کر کہتا ہے۔ بالآخر رخشندہ مہاجر ہو جاتی ہے۔ اپنی حویلی میں رخشندہ کو قدم رکھنے کا اختیار کہاں؟ ناول کا یہ مقام ایسا ہے جہاں ٹریجڈی اپنے نقطہ عروج کو پہنچ جاتی ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس کا یہ تجزیہ صداقت پر مبنی ہے:

''تقسیم ہند کے سانحہ تک پہنچتے پہنچتے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے قرۃ العین حید کے جذباتی اور فکری دھارے نے ایک کروٹ بدلی ہے۔ مشترکہ قومیت مشترکہ کلچر کی بقا اور قومی آزادی کے جو خواب وہ دیکھ رہی تھیں ان کی شکست کا کرب پی چوکی موت کے مرثیہ میں شدت کے ساتھ ابھرتا ہے۔ پھر آخر میں دہلی سے رخشندہ کی واپسی غفران منزل میں قائم دفتر کے سنتری کا اسے روک کر یہ کہنا کہ '' شریمتی مہیلاؤں کے ری سیٹلمنٹ کا دفتر امین آباد میں کھلا ہوا ہے'' نہ صرف یہ کہ تعلق

دار(قضا) طبقے کی نزاعی ہچکی کا منظر ہے بلکہ یہ ناول ایک تمثیلی رنگ میں ہندوستانی مسلمانوں کا المیہ بھی بن جاتا ہے۔گویا اپنے ہی وطن میں مہاجر ہو جاتے ہیں۔''(۱۵)

ناول کے آخری حصے میں جس کا عنوان ہے''منزل لیلیٰ''اس میں مایوسی کی پرچھائیاں ملتی ہیں۔ جہاں نہ تہذیب رہتی ہے نہ قدریں بلکہ مشترکہ تہذیب اور اشرافیہ کی برتری سب خاک میں مل جاتی ہیں۔اس انقلاب کا اثر نہ صرف غفران منزل بلکہ سارا ہندوستان تہذیبی اقدار و روایات سے خالی ہو چکا ہے۔گاندھی جی،نہرو اور مولانا آزاد اس مشترکہ تہذیب کے سرمائے کو بچانے میں لگ جاتے ہیں مگر لاحاصل! کوئی کسی کی نہیں سنتا تھا۔ قرۃ العین حیدر نے اس عظیم ٹریجڈی کو نہ صرف انسانوں کے قتل تک محدود رکھا ہے، بلکہ اس کا دائرہ تہذیب وثقافت اور علم وادب تک پھیلا دیا ہے۔ناول سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں جس میں فسادیوں نے علم وادب کو بھی جلا کر خاکستر کر دیا تھا:

''پنڈت جی نے بلدیو سنگھ سے کہا خدا کے لئے دلی کی حفاظت کے کام پر فوج اور ملٹری پولیس میں مسلمان افسر بھی رکھ لو۔لیکن حسب معمول ان کی کسی نے نہیں چلنے دی۔ان کے پاس فون آیا مکتبہ جامعہ جل رہا ہے،خدا کے لئے کچھ کیجئے۔وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور انہوں نے چلا کر کہا:ارے یہ کیا کر رہے ہو!اس مکتبہ کو تو چھوڑ دو یہ محض کاغذوں کا انبار نہیں ہے یہ ایک پوری نسل کا سرمایہ ہے،قوم کی عزیز ترین دولت ہے۔مستقبل کے لئے ہمارا زادراہ ہے۔اس کے لئے اسے بنانے اور اس ذخیرے کو جمع کرنے کے لئے ذاکر حسین نے اپنی آنکھیں کھوئی ہیں۔ آنسوان کے پلکوں پر جھلملاتے رہیں لیکن فسادیوں کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔''(۱۶)

قرۃ العین حیدر نے ناول میں مسلمانوں کی بدحالی اور انکے ساتھ ہو رہے ظلم وستم کو حقیقی تناظر میں پیش کیا ہے۔ جسے پڑھ کر اس وقت کے واقعات اور مسلمانوں کے حالات کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔اس ضمن میں ایک اقتباس دیکھئے:

''مسلمان.....لاحول ولا،.....مولانا نے داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا۔کنور عرفان کی اولاد ایک سرے سے مسلمان ہی نہیں ہے۔ان کے لڑکے شراب وہ پئیں،انگریزی ناچ ناچیں،ہر وقت کا انگریزوں،کافروں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا،سؤر بھی یقیناً کھاتے ہوں گے،بلکہ میرا تو خیال ہے کہ ان کی لڑکی شادی بھی کسی ہندو سے کرے گی۔''(۱۷)

۱۹۴۷ء کا سب سے تابناک پہلو یہ ہے کہ اس نے ہندوستانیوں کو ان کے وطن کے آزادی کا پیغام سنایا لیکن اس کا کربناک پہلو بھی ہے جسے تقسیم ہند سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جنگ آزادی میں دونوں قوموں نے قربانیاں اس لئے دی تھیں کہ اپنا ملک اور اپنی حکومت کے بعد ان کے دن خوشی سے گزریں گے۔ لیکن ابھی آزادی کا اعلان ہونا ہی تھا کہ یہ وحشیانہ فعل پر آمادہ ہوگئیں۔ شائستگی، انسانیت اور تہذیب کے لبادوں کو تار تار کر کے انہوں نے بربریت اور بہیمیت کا وہ ننگا ناچ ناچا کہ تاریخ انسانیت کی اس کی نظیر مشکل سے ملتی ہے۔ سفاکی، قتل و غارت گری، اجتماعی عصمت دری وغیرہ تقسیم ہند کی رہین منت ہے۔ ایک حساس فنکار ہونے کی حیثیت سے قرۃ العین حیدر نے تاریخ کے اس المناک عہد کی نباضی کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے جو قابل تعریف ہے۔ رخشندہ کے حوالے سے مصنفہ کا موقف ملاحظہ ہو:

> ''ارے ہم تو آزادی کے دیوانے تھے، ہم چاہتے تھے کہ ہماری جنتا کے رہن سہن کے ڈھنگ کا معیار اونچا ہو جائے۔ ہماری بڑی آرزو تھی کہ جاہل اور بھوکا نہ رہے..... اس لئے ہم ''نیوایرا'' میں شعلہ ریز مضمون لکھتے تھے۔ یونین میں تقریریں کرتے تھے۔ ہڑتالیں کرواتے تھے..... ہم نے آزادی کے لئے برطانوی فوج اور پولیس کی گولیاں کھائیں اور جیلوں کی چکیاں پیسیں اور آزادی ملتے ہی ہم نے خون کے سمندر ایک دوسرے کو ڈھکیل دیا۔'' (۱۸)

ناول کے اردگرد کمیونزم کا جال ہے۔ جب ملک میں دوقومی نظریے پروان چڑھ چکا ہے۔ اس کی بنیاد پر ملک کے بٹوارے کا مطالبہ اپنی شدت پر پہنچ چکا ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے ہیں۔ اس خوف سے کنور ..... پولو اور راج کماری رخشندہ محفوظ مقام پر جانے کے لئے ریل گاڑی کا سفر کر رہے تھے۔ تفریق و شناخت کا مسئلہ اس وقت پیش آیا جب جب انگریزوں نے مختلف فرقوں میں تفریق پیدا کر دی۔ اعلی طبقے میں مذہبی تفریق بہت کم تھی لیکن نچلے طبقے اور دیہات میں ہندو مسلم میں فرق نمایاں تھا۔ ہندو مسلم کی ایک ہی روایت تھی لیکن ان کے گھروں کے اندر طور طریقے ایک دوسرے سے مختلف تھے۔

غرض کہ اس ہنگامی کیفیت میں خدشات و مسائل کے زیر سایہ تہذیب، اخلاق، سماجی اقدار اور معاشرتی ہم آہنگی کی ارتھی جل گئی۔ ایک طرف نقل مکانی نے معیشت کو کچلا تو دوسری طرف ہجرت نے زخموں کو ناسور بنا دیا۔ قرۃ العین حیدر نے ناول رخشندہ کی سوچ کو آزد چھوڑ دیا۔ وہ کردار کے اظہار پر قدغن

نہیں لگا تیں۔''میرے بھی صنم خانے'' کی رخشندہ اوراس کے نیشنلسٹ ساتھی جنہوں نے حصول آزادی کے لئے جدوجہد کی تھی تقسیم کے بعد کی صورت حال پر اس طرح ماتم کرتے ہیں:

''یہ انجام ان سارے خوابوں کا جو ہم نے شفق کے سائے تلے اکٹھے دیکھے تھے۔انہوں نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ یہ گھاؤ۔۔۔ یہ تاریک کھائیاں۔۔۔ یہ دہشتناک غار۔ یہ خون۔ یہ شعلے.....ارے یہ کیا ہو گیا؟ یہ تم نے کیا کر دیا۔دلوں کے درمیاں جو یہ بے پناہ نفرت کی اتھاہ خلیج حائل ہو گئی۔ روحوں میں جو یہ زخم پیدا ہو گئے کیا یہ صدیوں تک بھی کئے جا سکیں گے..... ہم ایک دوسرے کے لئے ہمیشہ کے واسطے اجنبی بن کر رہ جائیں گے..... ہم ایک دوسرے کو شبہے اور نفرت کی نگاہوں سے دیکھیں گے۔''(۱۹)

اور پھر ناول کے آخر تک یہ صلیب رخشندہ کو ہی اٹھانی پڑی۔سب بچھڑ جاتے ہیں آخر میں چل کر پی چو مارا جاتا ہے۔ پی چو اور کرن کی موت کے بعد رخشندہ ان کی آئیڈیل نوجوانوں کے ذہنی انتشار کا سمبل بن کر سامنے آتی ہے۔ رخشندہ کا ذہنی انتشار اس پورے نوجوان طبقے کا ذہنی انتشار ہے جس کی حسین دنیا کی تباہی اس ناول میں پیش کی گئی ہے۔ پروفیسر عبدالسلام ''میرے بھی صنم خانے'' پر اظہار کرتے ہوئے تہذیبی زوال پر قرۃ العین حیدر کی تعریف کرتے نظر آتے ہیں:

''تقسیم کے بارے میں قرۃ العین حیدر کا رویہ،فسادات کی بربریت اور تہذیبی زوال پر وہ جس طرح ماتم کرتی ہیں وہ بلند انسانی اقدار کا حامل نظر آتا ہے۔ یہاں وہ صرف دردمند انسان نظر آتی ہیں جنہیں انسانیت کے مٹ جانے کا شدید غم ہے۔''(۲۰)

قرۃ العین حیدر جو صف اول کی ناول نگار ہیں اپنے ناولوں میں تقسیم ہند کو حقیقی تناظر میں پیش کیا ہے۔ چونکہ وہ خود دو قومی نظریے کی حامی نہ تھیں اس لئے ہندوستان کا بٹوارہ ذہنی طور پر قبول نہ کر سکیں۔یہی وجہ ہے کہ معاشرتی ٹوٹ پھوٹ اور غارتگری سے جھلا کر انہوں نے اپنا سارا غم وغصہ تقسیم کے فیصلے ہی کے خلاف اگل دیا ہے۔

قرۃ العین حیدر کے تمام ادبی تخلیقات میں'' آگ کا دریا'' اہم مقام رکھتا ہے۔ یہ ناول قدیم ہندوستان کی تہذیب وتمدن سے لے کر تقسیم ہند اور قیام پاکستان کے تمام حالات و واقعات کا احاطہ کرتا

ہے۔اس طرح یہ ناول ڈھائی ہزار سالہ تاریخ کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔اس ضخیم ناول کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ناول کا ابتدائی حصہ قدیم ہندوستان یعنی ویدک عہد سے شروع ہوکر مسلم دور حکومت کی ابتدا تک ہے۔ یہ حصہ ناول کی تمہیدی فضا کو ہموار کرتا ہوا آگے کی جانب بڑھتا ہے۔جس میں گوتم نیلمبر قدیم ہندو تہذیب وتمدن کی علامت بن کر سامنے آتا ہے۔دوسرا حصہ مغلیہ خاندان کا دور عروج تک ہے۔اس حصے میں گوتم نیلمبر فلیش بیک کی طرح پیچھے چلا جاتا ہے۔اور اس کی جگہ ابوالمنصور کمال الدین لے لیتا ہے۔ جو نہ صرف علم وادب کا رسیا ہے، بلکہ میدان زار کا ایک کامیاب جنگجو بھی ہے۔اس کی شخصیت میں عرب کا جلال اور عجم کا جمال دونوں خوبصورتی سے سمٹ آئے ہیں۔ابتدا میں وہ علم کی جستجو میں سر گرداں رہتا ہے۔لیکن جنگیں اس کی زندگی میں کبھی پیچھا نہیں چھوڑتیں۔تباہی، بربادی اور خونریزی سے اس کا دل وماغ پژمردہ اور مضمحل ہوجاتا ہے۔

''قدیم ہندوستان سے لے کر آزادی تک ایک ہی شخص بار بار پیدا ہوتا ہے جس کا نام گوتم نیلمبر ہے۔''(۲۱)

تیسرا حصہ اودھ کے شہنشاہوں اور حکمرانوں کے دور تنزل پر مرکوز ہے۔اس حصے میں اس عہد کو قرۃ العین حیدر نے اپنا ہدف بنایا ہے۔جس کا تعلق لکھنؤ کے بادشاہوں، امیروں اور نوابوں سے ہے۔اور آخری حصہ تقسیم وطن اور اس کے بعد ہند وپاک میں پیدا شدہ نئے مسائل کو پیش کرتا ہوا ختم ہو جاتا ہے۔ناول کے آخری حصے میں قرۃ العین حیدر نے بے باکی اور جرات مندی کے ساتھ قیام پاکستان پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، اور اس قومی حادثہ پر نہایت مفکرانہ انداز سے روشنی ڈالتے ہوئے اس کے درد و کرب کو نمایاں کیا ہے۔قرۃ العین حیدر نے ''آگ کا دریا'' میں ہندوستان میں بود و باش اختیار کرنے والے سبھی قوموں کی طرز زندگی اور ان کی طرز رہائش وعروج وزوال کی کہانی بیان کی ہے۔ ہندوستا کی سرزمین کی بڑی بڑی طاقتور سلطنتیں قائم ہوئیں اور وقت کی آندھی کے ساتھ تباہی و بربادی کی شکار ہوگئیں۔ وقت در اصل ایک آگ کا دریا ہے جس میں انسان، بادشاہ، امیر وغریب سبھی اپنی تمام تر قابلیت، بہادری اور ذہانت رکھنے کے باوجود ایک بے وقعت تنکے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جو تاریخی جبر اور انسانی جبلت کی شر پسندی کے آگے بے بس اور لاچار ہیں۔لیکن ان سب سے قطع نظر ہندوستان کی تہذیب اور کلچر کی شناخت اور اس کی

انفرادیت ہمیشہ ہر دور میں قائم رہی۔ ہندوستانی تہذیب وتمدن اور اس کی اعلیٰ اور امتیازی خوبیوں کو قرۃ العین حیدر نے اس ناول میں نمایاں کیا ہے۔اس سلسلے میں وقار عظیم یوں رقمطراز ہیں:

''قرۃ العین حیدر نے'' آگ کا دریا'' میں کسی ایک طبقہ یا گروہ کی زندگی یا کسی ماحول میں رہنے والے انسانوں کی کہانی نہیں کہی بلکہ انسان کی کہانی کہی ہے۔اس انسان کی جس کو ہر دور میں ایک نئی قیامت کا سامنا پڑتا ہے۔ جو ہر لہر میں ایک کشمکش میں مبتلا رہتا ہے۔جس پر ہر دور میں خوف کے بھیانک سائے منڈلاتے رہتے ہیں۔ جسے ہمیشہ تنہائی کے احساس نے ستایا ہے۔اور رلایا ہے جو ہر لمحہ میں وقت کے ایک طلسم میں گرفتار رہتا ہے۔البتہ اس قیامت کی صورت اس کشمکش کی اور خوف کی نوعیت اس احساس کی تنہائی کی کمیت بدلتی رہتی ہے۔اور وقت نئے روپ میں ظاہر ہوکر ان میں سے ہر ایک پر اپنا ایک مخصوص رنگ شامل کرتا ہے۔''(۲۲)

''آگ کا دریا'' میں چمپا ایک نسوانی کردار ہے جو مختلف زمانوں میں مختلف روپ دھارن کر کے سامنے آتا ہے۔ یہ ایک ایسی خاتون ہے جو زیر بحث ناول میں قارئین پہلی مرتبہ چمپا کے نام سے متعارف ہوتے ہیں۔ جسے ایک برہمن طالب علم گوتم نیلمبر دل ہی دل میں محبت کرتا ہے۔ وہ ایک ماہر رقاصہ ہے اور فلسفیانہ ذہن رکھتی ہے۔ایودھیا کے راج گرو کی بیٹی نرملا کی عزیز ترین سہیلی ہے۔ چندر گپت موریہ کے حملہ کے بعد وہ چانکیہ مہاراج کے کسی بدصورت افسر سے بیاہ دی جاتی ہے۔گوتم اسے شہر شہر ڈھونڈتا ہے۔تھیٹر کا اداکار بننے کے بعد ایک دن وہ اس حالت میں ملتا ہے کہ اس کی گود میں ایک بچہ ہے مگر اس کے باوجود ایک دوسرے کو اب بھی روح کی گہرائیوں سے چاہتے ہیں،لیکن مذہب کی اونچی دیوار یہاں بھی ان کا تعاقب کرتی ہے۔گوتم ایک مرتبہ پھر جنگل کی طرف گامزن ہوتا ہے اور ندی پار کرتے ہوئے ڈوب کر مر جاتا ہے۔

دوسری دفع چمپا ایودھیا کے ایک پنڈت کی بیٹی چمپاوتی کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔اسے اس زمانے کے بادشاہ کے کتب خانے کا نگراں ابوالمنصور کمال الدین گھاٹ پر ملتا ہے۔ان دونوں میں محبت کی کونپل پھوٹ پڑتی ہے۔ چمپاوتی بھگت کبیر اور سادھوؤں کی پرستار ہے اور مذہب کی تفریق سے بلند ہوکر ہندوستانی یگانگت اور انسانی دوستی پر اس کا ایقان ہے۔ابوالمنصور جب دنیا کے بکھیڑوں سے تنگ آکر ایودھیا واپس آتا ہے تو چمپا اسے کہیں نہیں ملتی۔ وہ بنارس کے حلقہ ادارت میں شامل ہو جاتا ہے اور ان کی جلاوطنی

کے بعد وہ بنگال کی راہ لیتا ہے۔لیکن وقت مرگ تک وہ چمپاوتی کی یادکوفراموش نہیں کر پاتا۔تیسری بار چمپا لکھنؤ کی مشہور طوائف چمپابائی کے روپ میں دکھائی دیتی ہے۔ جوایک خوبصورت سرکاری کلرک گوتم نیلمبر سے شادی کرنے کی خواہش مند ہے۔لیکن وہ اسے ٹھکرا کر چلا جاتا ہے۔وہ کلرکی چھوڑ ساری توجہ اپنی تعلیم پر مرکوز کرتا ہے۔اور پروفیسر بن جاتا ہے۔زندگی کے آخری ایام میں لکھنؤ کے اس پروفیسر گوتم نیلمبر دت کو چمپا بھکارن کے طور پر ملتی ہے۔آخری مرتبہ چمپا کوایک پڑھے لکھے متوسط مسلم گھرانے کی لڑکی چمپا احمد کی صورت میں پیش کیا گیا ہے، جو بیرون ممالک بھی جاتی ہےاوراعلیٰ تعلیم اورذہانت کے باوجود کسی مرد کا دل نہیں جیت سکتی۔قرۃالعین حیدر نے اس تاریخ ساز ناول ''آگ کا دریا'' میں چمپا کے یہ چاروں روپ ایک ہی کردار کا تسلسل کہلا سکتے ہیں کہ اشاراتی انداز میں یہ سب مختلف زمانوں کی ہندوستانی عورت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ جومختلف سیاسی، سماجی ادوار میں پدرانہ نظام میں ٹکرا جاتی ہیں اور اس کے جذبات واحساسات ادھورے رہ جاتے ہیں۔زیر بحث ناول میں چمپا ہر ہندوستانی عورت کی بہترین نمائندگی کرتی ہے۔وہ کبھی ہندواور کبھی مسلم اور کبھی شریف اوراعلیٰ خاندانوں سے تعلق رکھتی ہےاور کبھی طوائف کا بدترین پیشہ اختیار کرتی ہے۔قرۃالعین حیدر نے دراصل چمپا کو ہندوفلاحی کے تحت سامنے لایا ہے کہ جن کے ہاں انسان مرتا ہےاور اس طرح جنم مرن میں وہ مختلف حالتوں سے گزرتا ہے۔اس لئے چمپا پہلے دور میں ایودھیا کے راج گرو کی بیٹی کے بھیس می نظر آتی ہے جہاں اسے زندگی کے تمام عیش وآرام میسر ہیں۔اپنی ذہانت کی بنیاد پر گوتم نیلمبر سے شدید محبت کرتی ہے۔وہ زندگی اور رہبانیت کے فلسفے پر اس سے مباحثہ کرتی ہے،لیکن ان تمام اوصاف کے باوجود وہ وقت اور حالات کے بھنور میں پھنس کر مجبوراور بے بس ہوجاتی ہے۔وہ حالات کے جبر میں بے گھر ہوجاتی ہےاوراپنی دوراندیشی کے باوجود نہ چاہتے بھی ایک معمر برہمن سے شادی کرلیتی ہے، گویا یہاں قرۃالعین حیدر نے چمپا کے کردار کو ہندوستان کی صدیوں پرانی تہذیب میں عورت کی سماجی حیثیت اوراس کے ساتھ مردانہ سماج کا غیر منصفانہ دکھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔وہ ہر حالات میں یہ باور کرانا چاہتی ہے کہ مرعورت جس مقام اور جس بھی حالت میں رہے وہ عورت ہی رہتی ہے۔اس میں پیار محبت اور ہمدردی کا کا مادہ موجود رہتا ہے۔لیکن مرد استحصالی شکنجہ اسے توڑ کر رکھ دیتا ہے۔چمپا بوڑھے برہمن کی بیوی بننے پر کس طرح مجبور ہوجاتی ہے۔ملاحظہ ہو یہ اقتباس:

''اسے وہی کرنا پڑا جو ایک عورت کی حیثیت سے اس کے بھاگ میں لکھا تھا اور جو غالباً اس کا فرض تھا.....چمپک کا دھرم تھا کہ اس کی پرستش اور اس کی خدمت کرے، کیونکہ وہ اس کا شہر تھا اور وہ اس کی خدمت کرتی تھی جیسے پاٹلی پتر کی اور ہزاروں گرو پتنیاں۔ان میں سے ایک وہ بھی تھی اس میں کوئی خاص بات نہ تھی اور اس کی گود میں اس کا بچہ تھا اور وہ اپنی سہیلی سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے میں مصروف تھی۔فلسفوں کے تذکرے کا وقت نکل چکا تھا۔''(۲۳)

درج ذیل اقتباس اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ عورت اپنی تمام فطری صلاحیتوں کے باوجود شوہر پرستی اور اس کی خدمت پر مامور کی گئی ہے۔سماج اور دھرم کے ٹھیکیداروں نے اس پر ایسی ایسی نازیبا اور بے جا بندشیں اور پابندیاں عائد کر دی ہیں کہ وہ انتہائی قابل رحم ہستی بن کر رہ گئی ہے۔چمپا بھی ایک ایسی ہی عورت ہے جو ہر جنم میں ایک بے بس و مجبور عورت کی حیثیت سے دکھائی دیتی ہے۔وسطیٰ عہد میں وہ برہمن زادی چمپاوتی بن کر مشرق وسطیٰ سے آنے والے ابوالنصور کمال الدین کی محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے اور اسے اپنا شریک زندگی بھی تسلیم کرتی ہے۔کمال الدین عربی اسلامی تہذیب و تمدن کی نمائندگی کرتا ہے جب کہ چمپاوتی ہندوستانی برہمن خاندان کی نمائندگی ہے دونوں کے درمیان جو گفتگو ہوتی ہے اسے قرۃ العین حیدر نے اس طرح قلمبند کیا ہے:

''تم بھی برہمن ہو اور تمہاری ذات اور اونچی ہو جائے گی سیدانی کہلاؤ گی مجھ سے بیاہ کر لو نا بھئی مگر ہم تو تم کو یونہی اپنا پتی مانتے ہیں۔یہ سن کر وہ چکرا گیا وہ کیسے میرا تم سے بیاہ کہاں ہوا ہے یعنی کہ میں تم سے میرا مطلب یہ کہ اس سے کیا ہوتا ہے۔وہ ہنستی رہی ہم تو تم کو اپنا مالک خیال کرتے ہیں۔یہ بات تم نہیں سمجھ سکتے وہ اس طرح بے فکری سے ہنسا۔ہم تو صرف ایک آدمی کو اپنا پتی سمجھیں گے اور وہ آدمی تم ہو۔ہمارا تمہارا تو جنم جنم کا ساتھ ہے۔

جنم جنم کا ساتھ کیا خرافات ہے کمال نے بھنا کر کہا پھر تم نے جادوگری کی باتیں شروع کیں۔

اس میں جادو کیا ہے؟ چمپا نے جرأت سے پوچھا، کیا کوئی لڑکی کسی آدمی کو خود پسند کر سکتی ہے۔ہم نے تمہیں چنا ہے اور ہم تمہارے آگے جھکتے ہیں۔کیا کفر بکتی ہو، میں نعوذ باللہ خدا ہوں، ہو تو بھی دل ہی تو خدا کو جنم دیتا ہے۔وہ پھر زور سے ہنسی۔''(۲۴)

قرۃ العین حیدر کی انفرادیت یہ ہے کہ انہوں نے تہذیبی سطح پر ہندوستان کی تقسیم کی المناکیوں کا ذکر

کیا ہے۔فرقہ واریت کی لہر کو اجاگر کرنے کے ضمن میں ایک جگہ انہوں نے دوقومی نظریے کی ابتدا سے قبل اور بعد کی صورتحال کو چمپا احمد کے حوالے سے یوں پیش کیا ہے:

''جب میں بنارس میں پڑھتی تھی میں نے دوقوموں کے نظریے پر کبھی گور نہ کیا۔کاشی کی گلیاں اور شوالے اور گھاٹ میرے بھی اتنے ہی تھے جتنے میرے دوست لیلا بھارگوا کے۔ پھر یہ کیا ہوا کہ جب میں بڑی ہوئی تو مجھے پتہ چلا کہ ان شوالوں پر میرا کوئی حق نہیں کیوں کہ میں ماتھے پر بندی نہیں لگاتی اور تپلیشور کی آرتی اتارنے کے بجائے میری اماں نماز پڑھتی ہیں۔لہٰذا میری تہذیب دوسری ہے، میری وفاداریاں دوسری ہیں، میں نے بسنت کالج میں ترنگے کے نیچے کھڑے ہوکر جن گن من گایا ہے۔لیکن مجھے وہاں پر اکثر ایسا محسوس ہوا ہے کہ مجھے اس ترنگے کے سایے میں اجنبی سمجھا جاتا ہے۔ میں تو اسی ملک کی باسی ہوں، اپنے لئے دوسرا ملک کہاں سے لاؤں۔''(۲۵)

وہیں دوسری طرف قرۃ العین حیدر نے چمپا کے ذریعہ ملک کی ترقی کے سنہرے خواب اور اس کے عزم وحوصلے کے اس طرح بیان کرتی ہیں:

''اس ملک کو دکھ کا گڑھ مسرت کا گھر بنا میرے اپنے ہاتھ میں ہے مجھے دا سروں سے کیا مطلب؟ اس نے اپنے ہاتھ کھول کر غور سے انہیں دیکھا۔رقاصہ کے ہاتھ آرٹسٹ یا لیکھک کے ہاتھ؟نہیں یہ صرف ایک عام اوسط درجے کی ذہین لڑکی کے ہاتھ ہیں جو اب کام کرنا چاہتی ہے۔(۲۶)

گویا چمپا کے اندر کچھ کر گزرنے کی خواہش ابھرتی ہے اور اس کا یہ ذہنی رویہ اس امر کا انکشاف ہے کہ انسان کو اپنی فطری صلاحیتوں کو راست صورت میں بروئے کار لانا چاہئے اسے اپنے تجربے ومشاہدے کی بنیاد پر اپنا راستہ کو دتلاش کرنا چاہئے اور ایک خودمختار زندگی جینے کی سعی کرنی چاہئے۔

''آگ کا دریا'' جیسے شاہکار ناول کے حوالے سے رفعت سروش نے قرۃ العین حیدر سے متعلق بڑی پتے کی باتیں لکھی ہیں۔وہ ایک جگہ رقمطراز ہیں:

''انہوں نے ہندوستان کی ہزاروں سال پرانی تاریخ کو اپنے فکروفن کا محور بنایا اور ان کے قلم سے ایک ایسا عظیم ناول نکلا جو قدیم وجدید اور رجعت پرستی اور ترقی پسندی سب کی حدیں پھلانگ گیا۔شعور کی رو میں انہوں نے جو کچھ کہا اس کو نام دیا'' آگ کا دریا'' یہ ناول برصغیر کی تہذیبی عظمت اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں۔''(۲۷)

تقسیم کے المیے کو سمجھنے کے لئے قرۃ العین حیدر نے اپنے ناولوں میں چند کرداروں کی سیرت پیش کر نے میں اپنی فن کاری کی ایسی جوت جگائی ہے تقسیم کے ناولوں کا ذکر ہوتے ہی ان کے کرداروں کے خدوخال قاری کے ذہن میں ابھرنے لگتے ہیں۔''میرے بھی صنم خانے'' کی رخشندہ،'' آگ کا دریا'' کی چمپا، چمپابائی، چمپاوتی، چمپک اور'' آخر شب کے ہم سفر'' کی دیپالی سرکار اور یاسمین بلمونٹ متعلقہ ناولوں کی نمائندہ کردار ہیں جو تقسیم ملک، فسادات اور ہجرت کی المناکیوں کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔

ناول'' آخر شب کے ہم سفر'' میں تقسیم در تقسیم کے موضوع کو مختلف انقلابی تحریکوں کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔اس ناول کا پس منظر ۱۹۴۲ء کا آندولن، بنگال کی دہشت پسند اور انقلابی تحریک، پاکستان کی تشکیل نو کا مطالبہ، تقسیم ہند اور قیام بنگلہ دیش ہے۔تاریخ اور وقت کی جبر کا احساس اور اس کے سامنے افراد کے رومان آئٹریلز اور تمناؤں کی شکست وریخت اس ناول کا مجموعی تاثر ہے۔اس تاثر کو قرۃ العین حیدر نے بنگال دہشت پسند تحریک میں شامل فرضی کرداروں کے ذریعہ اجاگر کیا ہے۔دیپالی سرکار، ریحان الدین، روزی بینرجی، اومارائے اور یاسمین بلمونٹ ناول کے اہم کردار ہیں۔سبھی تعلیم یافتہ لیکن متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ انقلابی کردار ان آئیڈیلز کو بروز طاقت حاصل کرنا چاہتے ہیں جس کو حاصل کرنے کا خواب ہندوستان کے نئے تعلیم یافتہ طبقے نے چوتھی اور پانچویں دہائی کے ہندوستان میں دکھایا تھا۔ بالآخر ناول کے سبھی کردار تھک ہار کر مصالحت کر بیٹھتے ہیں اور اس عہد کی سچائی یعنی سامراجیت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ناول کے کرداروں کا تعلق ڈھاکہ کے چار مختلف مکانوں سے ہے۔ چندر کنج، ارجمند منزل، ووڈلینڈ، للّی کاٹج اس دور کی مشہور عمارتیں ہیں جو چار جہت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ارجمند منزل جاگیردارانہ روایت کی یادگار نواب قمرالزماں کی رہائش ہے۔'چندر کنج' بنوئے چندر سرکار کی آرام گاہ ہے۔'' دیپالیا'' کی لاڈلی بیٹی ہے۔''اومادیوی'' ووڈلینڈ'' میں رہتی ہے۔''للّی کاٹج'' روزی بینرجی کا گھر ہے۔للّی کا باپ پادری ہے جو انگریزوں کا مداح اور وفادار ہے۔

قرۃ العین حیدر نے دیپالی کے توسط سے اگر تقسیم ہند کے المیے کو پیش کیا ہے تو یاسمین کے ذریعہ تقسیم پاک کی عظیم ٹریجڈی قلمبند کی ہے۔تحریک آزادی اور اور انقلابی تحریک کو کارگر اور مؤثر بنانے میں دیپالی سرکار کا کردار اپنی مثال آپ ہے۔ ہندوستانیوں کے خلاف انگریزوں کی سازش کا راز اٹھانے کی غرض سے

کلکٹر کی کوٹھی پر کلثوم کا روپ اختیار کر کے گھریلو ملازمہ تک بن جانے میں اسے گریز نہیں ہے۔ دراصل دیپالی کو حب الوطنی اور ایثار و قربانی کا جذبہ ورثے میں آیا ہے۔ اس کے چچا نے ملک کی آزادی کو ترجیح دیتے ہوئے خود کو پھانسی پر لٹکانا گوارا کیا تھا۔ ناول کے ایک مقام پر دیپالی سرکار نے تحریک آزادی میں اپنے کاندان کی خدمت کا حال جس دردرناک انداز میں اومارائے سے بیان کیا ہے اس سے مجاہدین آزادی کی بدحالی اور عسرت کا نقشہ کھینچ گیا ہے۔ مثلاً:

''ٹھاکردا کی زندگی میں ہی بابا اور کا کا تحریک میں شامل ہو کر جیل یاترا کے لئے گئے تھے۔ اس زمانے میں ہمارے یہاں ایسی غربت چھائی کہ بعض دفع رات کو مٹی کا تیل خریدنے کے پیسے بھی نہیں ہوتے تھے۔ صرف اسی امید نے ہم سب کو زندہ رکھا کہ انگریز سے چھٹکارا ملنے کے بعد دیش کے اندر سارے اندھیرے گھروں میں اجالا ہو جائے گا۔''(۲۸)

لیکن آزادی نے دیپالی سرکار کے خواب کی تعبیر پوری نہیں کی۔ ملک کے بٹوارے نے اسے کس نوعیت کا صدمہ پہنچایا ہے، دیپالی کی زبانی سنیے:

''ہم لوگ سن اڑتالیس تک ڈھاکہ میں رہے، بابا کی ایک مریض مترا بابو..... کلکتے کے کسی مسلمان سے اپنا مکان ایکس چینج کر کے پارک سرکس کلکتہ چلے گئے تھے۔ سر پری توش رائے کا خاندان بھی جا چکا تھا۔ وودلینڈز مین ایسٹ پاکستان گورنمنٹ کا دفتر بن گیا تھا۔ پارٹیشن سے ان بڑے لوگوں کو کوئی فرق نہیں پڑا۔ لیڈی رائے اطمینان سے ڈھاکہ آ کے وودلینڈ کا کرایہ وصول کر تیں، پرانے دوستوں کے ساتھ ڈھاکہ کلب میں اپنی شامیں گزارتیں اور واپس چلی جاتیں..... کھوکھو (دیپالی کا بھائی) پہلے ہی ویسٹ بنگال جا چکا تھا، اس نے کہا تھا کہ وہ سیکنڈ کلاس شہری بن کر ایسٹ پاکستان میں نہیں رہے گا۔ بالکل یہی بات انڈیا سے آنیوالے مسلمان وہاں کے لئے کہہ رہے تھے..... چندر کنج ایک بہاری مسلمان کے ہاتھ اونے پونے بیچ کر ہم لوگ کلکتہ روانہ ہو گئے کھوکھو مہاسبھا لیڈر بنتا جا رہا تھا، آر ایس ایس میں شامل ہو چکا تھا..... بابا چند منٹ خاموش رہے اور بولے چلو ہم اس ملک کو ہی خیرآباد کہتے ہیں۔''(۲۹)

محولہ بالا عبارت کا ایک ایک جملہ تقسیم ہند کا المیہ پیش کرتا ہے۔ قرۃ العین حیدر تقسیم کے کرب کو عیاں کرنے میں مہارت رکھتی ہیں۔ اس ضمن میں انہوں نے یاسمین بلمونٹ کی سیرت کے سہارے بنگالی اور

پنجابی مسلمانوں کی علاقائی عصبیت اور کشیدگی کو ہیش کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد یاسمین بلمونٹ برصغیر کو ترک کر کے ہیمبرگ میں پناہ لیتی ہے، جہاں ایسے افراد سے اس کا سابقہ پڑتا ہے جو قیام بنگلہ دیش کی تحریک کو کامیاب بنانے میں منہمک ہے۔ چونکہ یاسمین ہمبرگ کمپنی سے وابستہ ہے جس کے مالک منجابی مسلمان ہیں۔ جب بنگلہ دیش وار چھڑتی ہے تو کمپنی کا منیجر یاسمین کی حقارت کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے اور بنگلہ دیش کا وجود عمل میں آنے کے بعد بنگلہ دیشی مسلمان یاسمین پر مذکورہ کمپنی کی ملازمت ترک کر دینے کا دباؤ اس لئے ڈالتے ہیں کہ کمپنی کا مالک پنجابی مسلمان ہے۔ یاسمین اپنی ''گڈلک ڈائری'' میں لکھتی ہے:

> ''سابق مشرقی پاکستان کا حال بنگلہ دیشیوں کا ایک گروہ میرے پاس آیا تھا۔ انہوں نے مجھ سے مطالبہ کیا کہ میں فوراً اس دفتر میں کام کرنا چھوڑ دوں، کیوں کہ مقبول (کمپنی کا مالک) پاکستانی ہے۔ میں نے کہا پہلے ہم ہندوؤں کے خلاف تھے۔ اس لئے پاکستان بنایا۔ کیا مقبول مسلمان نہیں ہے؟ مگر وہ پاکستانی ہے اور میں یہاں کام کروں تو غدار۔'' (۳۰)

قرۃ العین حیدر نے ''آخر شب کے ہم سفر'' میں بنگالی کلچر اور بنگلہ زبان سے بنگالی مسلمانوں کی انسیت اور طرفداری کی لہر کو پیش کیا ہے جو برصغیر کی تقسیم چانی کا اہم سبب بنی۔ اس نقطہ نظر سے یہ ناول اردو کا واحد ناول ہے جس میں تہذیب اور زبان کے فرق و امتیاز کی بنیاد پر ملک کے بٹوارے کی ٹریجڈی کا المناک نقشہ کھینچا گیا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ جنگ آزادی سے ہی بنگالی مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد بنگالی کلچر اور بنگلہ زبان و ادب کی دلدادہ تھی۔ اس ناول کے ضمن میں عبدالمغنی یوں رقمطراز ہیں:

> ''آخر شب کے ہم سفر'' میں تاریخی، معاشرتی، سیاسی، معاشی، نظریاتی و انقلابی اور رومانی و جاسوسی عناصر ہم آمیز ہو کر ایک ایسے قصے کی ترتیب کا سامان کرتے ہیں جو معلومات سے افکار سے مملو اور جذبات سے لبریز ہے۔ اس میں قدرت کا حسن بھی ہے اور جمال کے پہلو بہ پہلو جلال کے نظارے بھی، کہیں لطافت ہے، کہیں صلاحیت، ایک طرف نور نغمہ ہے۔ دوسری طرف جنگ و جدل۔ اس لئے یہ ناول مختلف مذاق کے قارئین کو مختلف سطحوں پر متاثر کرتا ہے۔ اس کا پیمانۂ فن یقیناً ''آگ کا دریا'' سے زیادہ وسیع ہے۔ خواہ خالص فکر میں پہلے ناول کا مقام جو بھی ہو۔'' (۳۱)

موصوفہ نے اپنے سبھی ناولوں میں انسانی زندگی رزمیہ پیش کیا ہے۔لیکن زندگی کا یہ رزمیہ اس ناول میں انتہا کو پہنچ گیا ہے۔اس کا دارومدار مرکزی کردار دیپالی سرکار پر ہے۔اس بات میں کوئی شبہ نہیں۔

خدیجہ مستور نے بھی تقسیم وطن کے سانحے سے گزر کر اپنے دور کی سماجی، سیاسی اور تہذیبی تبدیلیوں کو اپنا موضوع بنایا ہے۔تقسیم وطن کے بعد تبادلہ آبادی، مہاجرین کے لئے نئے ملک کے مسائل، اور فسادات کی کربنا کی ان کی کہانیوں کا موضوع بنے ہیں۔اور ان کہانیوں میں خدیجہ مستور نے نہایت شدید ردعمل کا اظہار کیا ہے۔اس وقت انسانی زندگی میں جو پیچ وخم، شکست وریخت تخریب وتعمیر کی بنیاد پڑی ہوئی تھی۔یہ سارے مسائل دوسرے ناول نگاروں کی طرح خدیجہ مستور نے بھی پیش کیا ہے۔''آنگن'' اور ''زمین'' خدیجہ مستور کے عمدہ ناول ہیں جو افسانوی ادب میں شاہکار کا درجہ رکھتی ہیں۔پہلے ''آنگن'' کا ذکر کرتے ہیں جس کا کینوس دوسری جنگ عظیم سے شروع ہوکر تحریک آزادی تک پھیلا ہوا ہے۔ہندو پاک کا بٹوارہ اور تقسیم کے کچھ بعد کے عرصہ تک محیط ہوکر اختتام کو پہنچتا ہے۔نیز ان سب کے درمیان ناول کا مرکزی کردار عالیہ کا صبر وضبط وعزم وحوصلے کی بہترین روداد ہے جو دنیا کی تمام لڑکیوں کے لئے مشعل راہ ہے۔ناول ماضی اور حال دو حصوں میں منقسم ہے۔خدیجہ مستور نے اس ناول میں فرقہ وارانہ فسادات، ہجرت، اور متوسط مسلم طبقے کی بے بسی ومسائل کو ایک وسیع کینوس میں پیش کیا ہے۔اس ناول میں یوپی کے ایک مسلم متوسط گھرانے کی داستان شب وروز کو بیان کیا ہے۔جہاں مختلف سیاسی نظریات کے ماننے والے لوگ ایک ہی آنگن میں بستے ہیں، اور ہندوستانی معاشرے کے مختلف مسائل کو آنگن کے حدود میں واضح کیا ہے۔جو گھر کا ناقابل تقسیم حصہ ہوتا ہے۔یہ کہانی صف ایک آنگن کی ہی کہانی نہیں ہے بلکہ ہندوستانی معاشرے کی کی تقریباً ہر آنگن کی کہانی محسوس ہوتی ہے۔آنگن میں ہونے والی سیاست کی سرگرمیاں اور سیاسی شعور کی کارفرمائیاں آنگن میں رہنے والے افراد کے درمیان بدرجہ تم نظر آتی ہے۔اور ایک ہی آنگن میں اٹھنے بیٹھنے والے مختلف سیاسی نظریات کے حامل جس میں کوئی کانگریسی ہے تو کوئی مسلم لیگی۔لہٰذا قدم قدم پر نظریاتی تصادم کی کیفیت کا احساس بھی ہوتا ہے۔ناول کا موضوع حصول آزادی ہے۔جس کا نتیجہ تقسیم ہند کی شکل میں اور نئے ملک پاکستان کے قیام کی صورت میں ظاہر ہوا۔

اس کے علاوہ ناول نگار نے عورتوں کی سماجی اور معاشی حیثیت ومقام، ان کی تکالیف اور زوال آمادہ

جاگیرداری معاشرت سے پیدا شدہ عورتوں کی زندگی کی کشمکش کو اجاگر کیا ہے۔ آنگن میں زوال پزیر زمینداروں کی طرز زندگی اوراس ماحول میں پلنے والے مختلف رویوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔ جہاں متوسط طبقے کی عورتیں معمولی معمولی مسائل سے گھری ہوئی ہیں۔ سماج کی محرومیاں، بے بسی اور گھٹن، عورتوں کی زندگی میں رچ بس گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خدیجہ مستور نے عام عورتوں کی لاچاری اور نفسیاتی کشمکش کی تمام وجوہات کو نمایاں کرتی دکھائی دیتی ہیں۔

اس ناول میں بہت سے مسائل ملتے ہیں جن کا ہماری زندگی سے براہراست گہرا تعلق ہے۔ یہ ناول چھوٹے پیمانے پر تحریک آزادی کے عہد کا ایک منظرنامہ ہے جہاں ہر کردار تضادات کا شکار ہو کر معاشرتی مطالبات سے ہم آہنگی کھو چکا ہے۔ تہمینہ اور کسم دیدی بھی اسی تضادات کا شکار ہیں جو سخت گیر اقدار کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں جو خاندانی نجات اور مذہبی روایات کے نام پر اپنی محبت سے نہیں مل پاتیں۔ اسی جبر کا شکار اسرار چچا ہیں جو ایک داشتہ کی اولاد ہونے کی ذلت خاموشی سے برداشت کر رہے ہیں۔ یہ ان کا خاموش احتجاج ہے کہ وہ کسی کے لعن طعن کا کوئی جواب نہیں دیتے۔ وہیں چھمی جو باغیانہ تیور لئے پورے گھر میں دندناتی پھرتی ہے۔ اپنے حق کو حاصل کرنا اور فرض کو نبھانا اسے اچھی طرح آتا ہے۔ چھمی کا کردار متشدد مسلم لیگی خیالکی بہترین ترجمانی کرتا ہے۔ نظریاتی تبلیغ میں وہ ہمیشہ منہمک رہتی ہے۔ قیام پاکستان کی حمایت کرنے میں اپنے بڑے چچا تک سے خوف نہیں کھاتی۔ لیکن محبت کی سفاکی اور بیوفائی اس کے باغی مزاج کو کمزور بلکہ سرے سے دنیا کے آگے خود سپردگی کرنے پر آمادہ کر دیتی ہے۔ لیکن وہ پھر بھی ہار نہیں مانتی اور بالآخر وہ اپنی دیرینہ چاہت کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

ناول کا سب سے اہم کردار عالیہ ہے جس کو اپنے سامراج مخالف باپ کا آئیڈیلزم ورثہ میں ملا تھا۔ تقسیم ہند کے بعد عالیہ اپنی خود پسند ماں کے ساتھ لاہور ہجرت کرنے پر مجبور ہوتی ہے مگر اس کے بڑے چچا جو ایک سیاسی مبلغ اور کٹر کانگریسی ہیں، ہجرت سے اتفاق نہیں رکھتے نظریاتی تصادم کے دوران عالیہ کی والدہ اس کے بڑے چچ کی شان کے خلاف گفتگو کرتی ہیں۔ اس موقع پر عالیہ کا غیر جانبدارانہ رویہ قابل توجہ ہے۔ وہ اپنی والدہ سے کہتی ہے کہ:

''کیا آپ چلنے سے پہلے بڑے چچا کو یہی بدلہ دینا چاہتی ہیں؟ بڑے چچا نے کسی کو تباہ نہیں کیا،

بڑے چچا نے کسی کو دعوت نہیں دی تھی کہ آؤ میرا ساتھ دو۔ آپ آج اچھی طرح سن لیں کہ مجھے چچا سے اتنی محبت ہے جتنی ابا سے تھی۔'' (۳۲)

لیکن آخر کار اسے ہجرت کرنی پڑتی ہے۔ وہ اپنے آس پاس کی نفسانفسی کے ماحول سے تنگ آ کر مہاجر بچوں کو تعلیم دینے لگتی ہے۔ ہوس زر میں غرق نئی پاکستانی ریاست مین عالیہ ایک عالیہ ایک پر اعتماد اور ایک بے غرض عورت بن کر سامنے آتی ہے جس نے خدمت خلق کی پلیٹ فارم پر ذاتی مسرتوں کی قربانی دے دی تھی۔ وہ ایک سماجی کارکن بن جاتی ہے۔ آخر میں صفدر اسے اپنانا چاہتا ہے اور وہ نرم پڑنے لگتی ہے اور یہاں بھی کار کوٹھی اور دولت اس کے قدموں میں ڈالنے کے پیمان سننے کو ملتے ہیں۔ عالیہ کا آئیڈیلزم دنیاوی آسائشوں کے حقیر پھندوں میں گرفتار ہونے سے انکار کر دیتا ہے اور وہ تن تنہا رہ جاتی ہے۔ عالیہ اس سے شادی کا وعدہ کرنے کے بعد اسلئے انکار کر دیتی ہے کہ وہ ایک خود غرض اور جفاکش انسان ہے۔ لہٰذا وہ عالیہ کی ہمدردی کھو بیٹھتا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''میں شادی نہیں کروں گی اماں۔ آپ بھی سن لیجئے صفدر بھائی، میں شادی نہیں کروں گی۔ وہ کرسی سے اٹھی۔ اب جب آپ یہاں آئیں تو سن لیجئے گا کہ مجھے تہمینہ آپا یاد آتی ہیں، میں اس یاد سے چھٹکارا چاہتی ہوں۔ وہ تیز تیز قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بھاگنے لگتی ہے۔ خدا حافظ۔

جب وہ اپنے کمرے میں بے سدھ پڑی تھی تو اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ چھمی اس کے سینے پر دھم دھم کرتی گزر گئی_____

میں نے آپ کو ہرا دیا بجیا، میں نے آپ کو ہرا دیا بجیا

اس نے اپنے دونوں ہاتھ سینے میں باندھ لئے۔'' (۳۳)

یہاں ہمیں پہلی دفع ایک ایسی خوددار اور بلند روشن خیال لڑکی نظر آتی ہے جو اپنی فہم وفراست کی بنیاد پر مردانہ بالادستی کو ٹھکراتی ہے اور اپنی مرضی کے فیصلے لیتی ہے۔ بقول عبدالحق حسرت:

''عالیہ کسی مرد کی محبت کا اعتبار اس لئے نہیں کرتی ہے کہ جس ماحول میں اس نے آنکھ کھولی تھی۔ اس میں عورت کا وجود منجملہ سامان تعیش تھا یا پھر ایک کنیز یا بچہ جننے والی جورو کے۔ اس معاشرے میں عورت کا وجود مقصود بالذات نہ تھا وہ ایک شے تھی جسے خریدا، بدلا اور پھینکا جا سکتا تھا۔ اس

معاشرے میں اس کی شخصیت صاحب اختیار اور ارادہ نہ تھی۔ نہ تو اپنے شوہر کے انتخاب میں آزاد تھی اور نہ اس بات میں کہ وہ کسی مرد سے محبت کرے یا نہ کرے۔ اسے تنہا رہنے کی مکمل آزادی نہ تھی۔ اس ماحول میں مرد کی بے وفائی کے قصے عام تھے۔ اس نے کسم دیدی کا حشر خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ کس طرح اسکا عاشق اغوا کرنے کے بعد اسے تنہا مرنے کے لئے چھوڑ گیا تھا۔ اس ماحول میں عالیہ کا رویہ جمیل کی طرف بھی سمجھ میں آتا ہے۔'' (۳۴)

عالیہ ایک تعلیم یافتہ اور باشعور لڑکی ہے۔ وہ اپنی عقل و دانش کی بنیاد پر وقت اور حالات کا سامنا کرتی ہے۔ خدیجہ مستور نے عالیہ کے کردار میں واقعات سے زیادہ جذبات اور نرم روی کو اجاگر کیا ہے۔ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نے عالیہ کے کردار کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ:

''اردو کے کسی ناول کی ہیروئن اس سے زیادہ دل آویز نہیں ہوئی ہے اور نہ اتنے اونچے اخلاقی درجے پر دکھائی دیتی ہے وہ نہ تو ثمن کی طرح آزاد ہے اور نہ رخشندہ کی طرح انٹلکچوئل وہ ایک گھریلو لڑکی ہے جو خدیجہ مستور کی سیدھی سادی کردار نگاری کی بہترین نمونہ ہے۔'' (۳۵)

پاکستان ہجرت کر جانے کے بعد مہاجرین شرنارتھیوں کے مکانوں اور ملکیتوں کو ہڑپنے اور قبضہ کرنے پر کوشاں تھے۔ اس سچائی کو خدیجہ مستور نے ''آنگن'' میں بڑی ہنرمندی کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ عالیہ اور اس کی والدہ کو اس کے ماموں کے توسط سے جو مکان ملتا ہے اس کا بیان عالیہ یوں کرتی ہے:

''پانچویں دن ماموں نے ایک چھوٹی سی کوٹھی کا تالا تڑوا کر اماں کو ان کے جانے پر مجبور کیا..... ایک دن ماموں اکیلے آئے تو انہوں نے بتایا کہ کوٹھی اماں کے نام الاٹ کرادی ہے۔ اب اسے کسی بھی صورت میں چھوڑنا نہیں۔ پھر انہوں نے فرنیچر کی چند رسیدیں دیں کہ اگر کوئی پوچھے تو یہ دکھا دینا کہ ہم نے یہاں آکر سب کچھ کریدا ہے اس کوٹھی میں تو بس کباڑ بھرا تھا۔'' (۳۶)

''آنگن''، تقسیم ہند کے المیے کے موضوع پر ایک کامیاب ناول ہے جو متحدہ ہندوستان کی علامت ہے۔ ''زمین'' خدیجہ مستور کی ایک بہتری کاوش ہے۔ جس میں تقسیم ہند، فسادات اور ہجرت کے کرب کو اس کے حقیقی تناظر مین پیش کیا گیا ہے۔ ''زمین'' کو بھی ایک کاندان کے چند افراد کے ذکر سے قیام پاکستان کے ابتدائی زمانے کی ایک دستاویز میں بدل دیا گیا ہے۔ پس منظر میں برطانوی حکومت سے آزادی کے لئے

جمہوری تحریک کا بیان ہے۔ پھر فسادات اور ہجرت کے بعد کیمپوں کی زندگی کا ذکر ہے اور ازاں بعد قصے کا اہم ترین حصہ آجاتا ہے۔، جس میں ایک گھر کے حوالے سے نئے پاکستانی معاشرے میں موجود متضاد طبقوں کی کشمکش اور سماجی رویوں کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ بی اے پاس ساجدہ اپنے بوڑھے اور بیمار باپ کے ہمراہ مہاجر کیمپ میں پناہ گزیں تھی کہ اس کا باپ داعی اجل کو لبیک کہہ گیا۔ کیمپ میں آنے والے جانے والا ناظم اپنی بہن سلیمہ کے ساتھ آیا اور اسے اپنے گھر لے گیا۔ ناظم محکمہ بحالیات میں ملازم تھا اس کا چھوٹا بھائی کاظم اپنی تعلیم مکمل کر کے مقابلے کے امتحان میں بیٹھنے والا تھا۔ ان کے والد ''مالک'' نے چار کنال کی یہ کوٹھی جعلی کلیم میں الاٹ کرائی کرائی تھی۔ اور ابھی وہ کاظم کے مشورے پر کوئی باغ بھی ہتھیانا چاہتے تھے۔ کاظم ایک دنیادار اور بے ضمیر شخص تھا۔ جب کہ ناظم اس سے مختلف۔

خدیجہ مستور نے اپنے ناول ''زمین'' میں مہاجر کیمپ میں گھومنے والے ایک نیم پاگل بوڑھے کی مختصر سی جھلک پیش کی ہے۔ یہ بوڑھا کیمپ میں اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر ہر ایک سے یہی پوچھتا پھرتا تھا:

> ''میری بیٹی _____ میری بیٹی _____ میری بیٹی کہاں ہے؟'' بوڑھا اپنے بال نوچ کر زور زور سے چیخا اور پھر سر جکا لیا۔ چیخنے کے بعد جیسے اسے قرار آجاتا اور پھر گھنٹوں وہ ایک ہی طرح سے سر جھکائے بیٹھا رہتا۔''

ایک روز ایک آدمی نے اس بوڑھے سے زچ ہو کر پوچھا:

> ''بابا تم کس بیٹی کو پکار رہے ہو؟ وہ بیٹی نہیں تھی بابا۔ وہ لوٹ کا سب سے قیمتی مال تھی۔ وہ تمہارے چیخنے سے واپس نہیں آئے گی تمہاری آواز اس تک نہیں پہنچ سکتی۔''
>
> وہ بوڑھا وحشت زدہ آنکھیں پھاڑے اس آدمی کو گھورنے لگا۔
>
> ''تم جھوٹ بول رہے ہو۔ وہ ایک دم چیخا۔ وہ میری بیٹی تھی۔ وہ مال خزانہ نہیں تھی۔ میری بیٹی، میری بیٹی''
>
> اس کے بعد جب مخاطب نے اسے بتایا کہ اس کی بیٹی کا بدلہ چکا دیا گیا ہے تو بوڑھے نے ایک دم آستین چڑھا لیں اور گرج کر بولا:
>
> ''اچھا تم نے بھی بیٹیاں لوٹی ہیں۔'' (۳۷)

اس کے بعد وہ پوری طاقت سے مخاطب کو ایسے دھکا دیا کہ وہ گرتے گرتے بچا۔

مندرجہ بالا اقتباس میں تقسیم ہند کے جلو میں رونما ہونے والے فسادات کے کرب اور زیادتی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جہاں ایک بیٹی کی عزت کا بدلا دوسری بیٹی کی عزت سے چکایا گیا تھا۔ ساجدہ ناول کی ہیروئن ہے جو فساد اور ہجرت کی اذیت سے گزر کر ناظم کی پناہ گزین بنتی ہے۔ اس سانحے کے خوف نے صرف اس کے خاندان کو ہی اس سے نہیں چھینا بلکہ اس کا پورا وجود اور اس کی شخصیت اس اذیت سے دوچار نظر آتی ہے۔ اعتبار و اعتماد کا سارا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے اور اس کی جگہ بے یقینی اور خوف و ہراس لے لیتی ہے۔

وہیں تاجی کا کردار ہجرت کرنے والی بے بس اور لاچار لڑکیوں کی جنسی اور جسمانی استحصال کی علامت ہے۔ تاجی اپنی زندگی کی روداد اور تقسیم ملک کی ہولناکیوں کا تذکرہ ساجدہ کو یوں سناتی ہے:

> ''..... پاکستان بن گیا باجی! فسادات شروع ہو گئے۔ کسی کو ذات برادری کی خبر نہ رہی۔ میری ماں نے مجھے ایک قافلے کے ساتھ ڈھکیل دیا۔ کہتی تھی اپنے ملک میں جا کر کسی شریف آدمی کا ہاتھ پکڑ لیجیو، اور پھر وہ کڑے والے ہاتھ کو تھام کر غائب ہو گئی۔'' (۳۸)

لاہور کے والٹن کیمپ میں تاجی کو بے یار و مددگار پا کر ناظم کی ماں اپنے گھر لاتی ہے تاکہ امور خانہ داری میں اس سے مدد ملے۔ ان کی یہ ضرورت تو ضرور پوری ہوتی ہے لیکن ساتھ ناظم کا بھائی کاظم بھی اسے اپنی جنسی ہوس پورا کرنے کا بہترین وسیلہ سمجھتا ہے۔ حد سے زیادہ ظلم و زیادتی اور جبر و استحصال اس کی موت کا سبب بنتے ہیں۔ اس طرح تاجی ایک ایسی بے بس و مظلوم عورت کی علامت بن جاتی ہے جسے ہجرت سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ ایک اقتباس میں تاجی کی صورتحال کا نقشہ نہایت عبرت ناک طریقے سے پیش کیا گیا ہے:

> ''تاجی نے پھر آنکھیں بند کر لیں، اس کے سیاہ پپڑیائے ہوئے ہونٹ اب بھی لرز رہے تھے۔ وہ (ساجدہ) تاجی کے ہونٹوں پر جھک گئی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی گھٹی ہوئی سانسوں میں وہ بدبدا رہی تھی، اماں..... وہ شریف ہاتھ نہیں ملا، اماں کوئی نہیں ملا، میرے..... پھر آواز ڈوب سی گئی۔'' (۳۹)

کاظم کا کردار انتہائی سفاک اور عیار ہے۔ اس کی بدکرداری اور جنسی اوباشی کا کوئی ثانی نہیں۔ سلیمہ کا کردار ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور خود مختار کردار کی شکل میں ابھرتا ہے۔ جو ایک دانشورانہ سوچ رکھتی ہے۔ اپنی ماں کے غلط رویے سے بدظن رہتی ہے، کالج میں نوکری کرتی ہے، معاشی محکومیت سے آزاد اور گھریلو ماحول سے

بیزار۔اس کی زندگی کے صفحے پر مرد کا کوئی تصور نہیں ہے۔ وہ عورت اور مرد کے درمیان ازلی وابدی رشتے کو ہوس اور جنسی بھوک سے تعبیر کرتی ہے۔

''مرد اور عورت کی محبت محض بھوک کا دوسرا نام ہے اور یہ اتنی خودغرض بھوک ہوتی ہے جو سارے رشتوں ناطوں کی محبتوں کو چاٹ جاتی ہے۔ کال پڑ جاتا ہے مگر اس محبت کا پیٹ نہیں بھرتا۔''(۴۰)

جمیلہ ہاشمی کا ناول'' تلاش بہاراں'' آزادی کے بعد لکھے جانے والے اہم ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔آزادی کے بعد برصغیر ہندو پاک میں جس طرح نئی زندگی اور نئے معاشرے کے خواب دیکھے گئے،'' تلاش بہاراں'' اسی کی ایک تصویر ہے۔اس ناول کی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں معاشرے میں خواتین کی موجودہ صورتحال کو بہتر بنانے کی کوششوں کا پتہ چلتا ہے۔جس عہد می عکاسی اس ناول میں ملتی ہے اس دور کی مشرقی عورتوں کے حالات نہایت سنگین نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے ناول میں نسوانی کردار کثیر تعداد میں موجود ہے۔کنول کماری ٹھاکر، کرشنا، شوبھا، بینا اور نیرا وغیرہ اس ناول کے اہم کردار ہیں جس میں مرکزیت کنول کماری ٹھاکر کو حاصل ہے۔اس ناول میں ہر طبقے کی عورتوں کی طرز معاشرت اور ان کے گونا گوں مسائل کو بیان کیا گیا ہے۔بقول ڈاکٹر سید جاوید اختر:

''ناول کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اس کا موضوع'' تلاش بہاراں'' نہیں بلکہ عورتوں کی آزادی اور عظمت اس کا بنیادی موضوع ہے۔ یوں بھی چار سو اٹھارہ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں گنتی کے آخری چند اوراق فسادات اور انسانی دوستی کا تذکرہ پیش کرتے ہیں جب کہ بقیہ ساری روداد ہندوستانی عورت کی مظلومیت اور بے کسی کی تصویر کشی ہے۔کنول کماری ٹھاکر کے کردار کو مرکز بنا کر عورت کی عظمت اور آزادی کا خواب دیکھا گیا ہے۔''(۴۱)

''تلاش بہاراں'' میں آزادی سے پہلے کے اس عہد کو بیان کیا گیا ہے جب ہندوستان میں سیاسی اور سماجی شعور کی بیداری کی لہریں چاروں طرف پھیل رہی تھیں اور حصول آزادی کے لئے ملک کے گوشے گوشے سے جدوجہد آزادی کی سرگرمیاں زوروں پر تھیں۔تقسیم وطن کو غیر انسانی اور غیر اخلاقی رویہ قرار دیتی ہیں۔اور اس کی پوری ذمہ داری ہندو مسلم سادہ لوح انسانوں پر ڈالتی ہیں بلکہ ہندوستانیوں میں نفاق کا زہر پھیلانے کی تمام تر ذمہ داریاں غیر ملکی قوم انگریزوں کو ٹھہراتی ہیں۔ پھوٹ ڈالو اور راج کرو کی پالیسی کی وجہ

سے پورا ملک فسادات اور ہجرت کی زد میں آ گیا جس نے پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے کر تنکا تنکا بکھیر دیا۔ جمیلہ ہاشمی نے جس بہار کو شدت سے چاہا تھا اور جس کی آرزو انہوں نے خواب کی صورت میں کی تھی وہ قبل از وقت ہی خزاں میں تبدیل ہوگئی۔ انہوں نے اس عمل کا ذمہ دار کسی ایک فرقہ کو نہیں ٹھہرایا بلکہ اس عظیم سانحہ میں ہندو مسلم دونوں فرقے یکساں طور شامل رہے۔ جس کی عکاسی وہ اس انداز سے کرتی ہیں:

''انسان تیزی سے ہندو مسلمان بن رہے تھے۔ بھگوان کی مورتی کے سامنے جھکنے والے نفرت کا پرچار کر رہے تھے۔ خدا کی حمد و ثنا کرنے والے اور مسجد کی بلند میناروں پر چڑھ کر اذان دینے والے زہر گھول رہے تھے۔'' (۴۲)

لیکن سب سے زیادہ جمیلہ ہاشمی نے جس چیز کو اجاگر کیا ہے وہ ہندوستانی سماج میں عورت کی مظلومیت اور اس کے استحصال کی دردناک کہانی ہے۔ ناول کا کوئی کردار ایسا نہیں جو آزدی کی جدوجہد میں شامل نہ ہو۔ جمیلہ ہاشمی نے اپنے وسیع تجربات، عمیق مشاہدات اور روشن خیالی کا مکمل ثبوت پیش کیا ہے۔ اور تقسیم سے قبل ہند پاک کے دانشور طبقے کی ذہنی، جذباتی اور نفسیاتی کیفیت کا اظہار اپنے کرداروں کے ذریعہ کیا ہے۔ کنول کماری ٹھاکر بھی انہیں میں سے ایک ہے۔ جو ایک آئیڈیل لڑکی کی صورت میں سامنے آتی ہے اور معاشرے کی بے بنیاد مظالم کی شکار عورتوں سے ہمدردی کا اظہار کرتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے سارے حقوق کے لئے حتی الامکان کوششیں کرتی ہے۔ انہیں باوقار زندگی گزارنے کے لئے ان کی اندر کی پوشیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کی تلقین کرتی ہے۔ کنول کماری ٹھاکر کو ناول نگار نے دنیا کی تمام خوبیوں سے آراستہ کیا ہے۔ خوبصورت، باصلاحیت، باہمت وعزم وحوصلے کی زندہ مثال، بے لوث، ہمدرد وشفیق ،قوم پرست اور ایک بہترین منتظم ان تمام اوصاف سے بہراور ہے۔ ایک اچھی وکیل ہونے کے علاوہ بحیثیت عورت عورتوں کے دکھ سکھ میں شریک ایک نیک اور مہربان شخص ہے جو ان حقوق کو بحال کرنے کے کئے مقدمات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہے۔ امیر وغریب کی طبقاتی نظام کو بدلنے کی خواہاں ہے۔ جس نظام میں عورت محض مجبور، بے بس اور لاچار ہے۔ وہ کہتی ہے کہ:

''زندگی کی بنیادیں بدلنے کی ضرورتیں ہے اور کوشش کی ضرورت ہے۔ عام ذہنی سطح کو بدلنے کی ضرورت ہے اور میں یہ کام کروں گی۔'' (۴۳)

مذکورہ اقتباس کنول کماری ٹھاکر کے عزم اور ہمت کی غمازی کرتا ہے۔ وہ عورت کو معاشرے کا ایک اہم فرد تصور کرتی ہے جو سماج کی تشکیل و تعمیر میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ معاشرہ کو مستحکم کرنے اور اسے ایک بہتر سنت عطا کرنے میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہے۔ لیکن اس کی حیثیت کیا ہے؟ اس سوال کا جواب کون دے گا؟ ملاحظہ ہو:

> ''عورت کی عزت! کیا کہتی ہے پگلی جذباتی۔ کون سی عزت کا نام لیتی ہے۔ ہندوستان میں عورت ننگی ہے۔ عورت کی عزت اور آن خاک میں مل چکی ہے۔ عورت کہیں نہیں ہے۔ صرف گوشت کے رنگوں کے ہیولے ہیں۔ عورت کیا مذاق ہے یہ نام۔'' (۴۴)

جمیلہ ہاشمی عورتوں کے جذبات و احساسات کی ترجمانی بے حد دلکش انداز میں کیا ہے اور معاشرے بوسیدہ رسم و رواج اور ضعیف العتقادی کا مذاق بھی اڑایا ہے۔ جس میں درد بھی ہے اور تڑپ بھی۔ جسے پڑھ کر قاری بے اختیار کراہ اٹھتے ہیں اور سماج کی اس بے حسی اور خود غرضی پر از سر نو غور و فکر کرتے ہیں۔ بلا شبہ'' تلاش بہاراں''، تقسیم ہند، فسادات اور عورتوں کی سماجی صورتحاک کی بہترین مثال ہے۔

الغرض مردوں کی طرح خواتین ناول نگار نے بھی تقسیم ہند کے خونچکاں سانحہ کو بڑے ہی مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ فسادات اور ہجرت سے متاثر ہو کر عمدہ شہپارے تخلیق کی ہیں۔ ان کی تحریروں میں جذبات و احساسات کی وہ رو دکھائی دیتی ہے جسے ہم اعلیٰ درجے کی حقیقت نگاری اور ذاتی واردات سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ تقسیم ہند کے پس منظر میں لکھے گئے ناولوں میں خواتین ادیبوں نے جو کردار ابھارے ہیں وہ مرد ناول نویسوں سے کسی طور کم نہیں۔ فسادات و ہجرت کے موضوع پر ان ہوں نے دراصل انسانی ضمیر کو جھنجھوڑا ہے۔ اسے خواب غفلت سے جگایا ہے۔ تاکہ انسانیت کی آخری سان س نکلنے سے پہلے اسے ہوش آ جائے۔ درد مندی کے جذبات سے پُر۔ کبھی تلخی کی حدوں کو چھوتے ہوئے تو کبھی پچھتاوے کے انداز میں۔

حواشی

(1) August Bell:Women in the past, present& future, NBT, New Delhi, 1976, p.no.10

(2) August Bell:Women in the past, present& future, NBT, New Delhi, 1976, p.no.10

(۳) ڈاکٹر توحید خان، مرزا رسوا کے ناولوں کے نسوانی کردار، تخلیق کار پبلشرز، دہلی، ص ۳۷

(۴) پروفیسر زبیر صدیقی، عورت اور مرد کا مرتبہ: اقوام عالم میں، نذر ذاکر، ناشر مجلس نذر ذاکر، نئی دہلی، ۱۹۸۴ء، ص: ۳۸۸

(۵) ایضاً، ص: ۳۸۴

(۶) قرۃ العین حیدر آئینہ خانہ میں، نقوش کراچی ۱۹۶۲ء، بحوالہ ہندو پاک میں اردو ناول، ڈاکٹر انور پاشا، پیش رو پبلی کیشنز، دہلی، ص ۴۷

(۷) صالحہ بیگم، ہندوستانی سماج عورت کی اہمیت، ماہنامہ آج کل، جولائی ۱۹۷۲ء، ص: ۳۵

(۸) قرۃ العین حیدر، میرے بھی صنم خانے، ادارہ یوسف پبلشرز، راولپنڈی، ۱۹۴۷ء، ص: ۶۱

(۹) ایضاً، ص: ۴۲۶

(۱۰) ایضاً، ص: ۱۸۲۔۱۸۱

(۱۱) ایضاً، ص: ۶۰

(۱۲) ایضاً، ص: ۴۱۷

(۱۳) ایضا، ص: ۶۷

(۱۴) ایضاً، ص: ۴۵۴۔۴۵۶

(۱۵) تلاش و توازن، قمر رئیس، ادارہ خرام پبلی کیشن ہاؤس، دہلی، ۱۹۶۸ء، ص: ۳۹

(۱۶) ایضاً، ص: ۴۵۲

(۱۷) ایضاً، ص: ۴۲۶

(۱۸) ایضاً، ص: ۳۷۵

(۱۹) ایضاً، ص: ۳۹۸

(۱۳) قرۃ العین حیدر، میرے بھی صنم خانے، ادارہ یوسف پبلشرز، راولپنڈی، ۱۹۴۷ء، ص: ۴۰۰

(۲۰) پروفیسر عبدالسلام، ''قرۃ العین حیدر کے ناول کا جدید فن'' اعجاز پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ص: ۴۵

(۲۱) قرۃ العین حیدر، آگ کا دریا، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۹ء، ص: ۱۸۱۔۱۸۲

(۲۲) وقار عظیم، ایک ناول نگار، ادب لطیف، جنوری ۱۹۶۱، ص: ۴۹

(۲۳) قرۃ العین حیدر، آگ کا دریا، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۹ء، ص: ۱۲۸

(۲۴) ایضاً، ص: ۱۴۹

(۲۵) ایضاً، ص: ۳۴۴

(۲۶) ایضاً، ص: ۴۵۴

(۲۷) عینی آپا کچھ باتیں کچھ یادیں، مشمولہ بیباک، ستمبر ۲۰۰۷، مہاراشٹر، ص: ۳

(۲۸) قرۃ العین حیدر، آخر شب کے ہم سفر، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۸ء، ص: ۳۵

(۲۹) ایضاً، ص: ۲۷۸۔۲۸۱

(۳۰) ایضاً، ص: ۳۰۳

(۳۱) بحوالہ ارتضیٰ کریم، مضمون: آخر شب کے ہم سفر از ڈاکٹر عبدالمغنی

(۳۲) خدیجہ مستور، آنگن، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۴ء، ص: ۳۰۸

(۳۳) ایضاً، ص: ۳۵۲

(۳۴) عبدالحق حسرت، ''خدیجہ مستور: بحیثیت ناول نگار، اعجاز پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ص: ۱۴۱

(۳۵) سہ ماہی، فنون، لاہور، احسن فاروقی، ص: ۴۵

(۳۶) ایضاً، ص: ۳۲۰

(۳۷) خدیجہ مستور، زمین، ہمالیہ بک ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۴ء، ص: ۱

(۳۸) ایضاً، ص: ۶۷

(۳۹) ایضاً، ص: ۵۷

(۴۰) ایضاً، ص: ۲۳۶

(۴۱) ڈاکٹر سید جاوید اختر، اردو ناول نگار خواتین، بسمہ کتاب گھر، دہلی ۲۰۰۷ء، ص: ۱۴۷

(۴۲) جمیلہ ہاشمی، تلاش بہاراں، اردو اکادمی سندھ، کراچی ۱۹۶۱ء، ص: ۴۵۸

(۴۳) ایضاً، ص: ۱۲۷

(۴۴) ایضاً، ص: ۴۳۷

باب پنجم

تقسیم ہند، فسادات اور ہجرت

کے تناظر میں خواتین سے متعلق مسائل اور مرد ناول نگاروں کا رویہ

(نمائندہ مرد ناول نگاروں کے حوالے سے)

- عبداللہ حسین
- انتظار حسین
- عبدالصمد

تقسیم ہند، فسادات اور ہجرت

۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء اور پھر اس کے بعد کا دور انسانیت کے لیے ایک پر آشوب دور ثابت ہوا۔ بادشاہت کی فرسودہ عمارت اور جاگیردارانہ نظام کو انگریزی تسلط نے منہدم کرنے کے ساتھ ہندوستانی عوام کو اپنی غلامی کے شکنجے میں جکڑ لیا اور ہندوستان ایک 'نوآبادی' کی حیثیت اختیار کر گیا۔ استحصالی نظام کی حکمرانی رہی۔ عالمی حالات نے کروٹ لی۔ انگریزوں کے اقتدار کا زوال شروع ہوا۔ عوام کی اکثریت اس خوش فہمی کا شکار رہی کے انگریزوں کے جانے کے بعد برصغیر دنیا کے نقشے پر ایک آزاد اور خوش حال ملک کے طور پر ابھرے گا۔ مگر افسوس امن و خوش حالی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

ہندوستان کی تاریخ میں ۱۵/ اگست ۱۹۴۷ء ایسا دن تھا جس میں صدیوں میں پروان چڑھنے والی ہندوستانی تہذیب اور مشترکہ کلچر کو دفن کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی۔ خون میں شرابور یہ آزادی کچھ لوگوں کے لیے باعثِ فخر اور کچھ لوگوں کے لیے باعث ننگ ٹھہری۔ ہندوستان کی تقسیم سوچی سمجھی سازش تھی۔ انگریزوں نے ملک میں نفرت کا ایسا بیج بویا جس سے فرقہ پرستی کا لہلہاتا ہوا پودا اُگا۔ تقسیم نے انسانی زندگی کو اجتماعی و انفرادی ہر دو سطح پر کافی متاثر کیا۔ چنانچہ ۱۹۴۷ء میں ادب کی تاریخ کا ایسا واضح اور اہم موڑ بن گیا جس نے نئے ادبی رویوں کے موثر اظہار کے امکانات پیدا کر کے ادب کی کائنات کو خاصی وسعت عطا کی۔

تقسیم ہند نے کروڑوں لوگوں کو صرف تہ و بالا کر کے ہی نہیں رکھ دیا بلکہ اس حیوانیت کے سیلاب میں انسان دوستی اور اخلاقی قدریں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئیں۔ کوئی دل ایسا نہیں تھا جو زخم خوردہ نہ تھا۔ اپنے ہی ظالم تھے اور اپنے ہی مظلوم۔ مذہب کے نام پر اپنے ہی بھائیوں کو لاکھوں کی تعداد میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ معصوم بچوں کو تلوار کی نوک پر اچھال دیا گیا۔ عورتوں کے سہاگ اور سندور سے ایسا کھلواڑ کیا گیا کہ

انسانیت بھی شرمسار ہوگئی۔ مزدور وغریب طبقے نے تنکے جوڑ کر ننگے اور معصوم بچوں کو ٹھنڈ اور بارش سے محفوظ رکھنے کی خاطر چھوٹے چھوٹے گھروندے بنائے تھے۔ ان کی اس امید کو بھی شعلوں کی نذر کر دیا گیا اور نہ جانے کتنے زندوں کو بھی اپنے ہی جلتے گھر کے شعلوں کی نذر ہونا پڑا۔ جہالت اور بھکمری کے شکار یہ لوگ مذہبی جنون میں اپنے ہی بھائی کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ مختصر یہ کہ تقسیم ہند کے موقع پر جس بربریت اور وحشت اور درندگی کا مظاہرہ کیا گیا۔ برصغیر کی تاریخ میں اس کی دوسری مثال نہیں ملتی۔

قتل و غارت گری کے اس دور میں دونوں طرف کے مہاجرین کی مادری زبان اردو تھی۔ لہٰذا اردو ادب میں فسادات اور ہجرت سے متعلق مسائل کا ذکر آنا یقینی تھا۔ اس وقت کے مسلم و غیر مسلم ادیبوں نے انسانوں کے مردہ ضمیر کو بیدار کرنے کے لیے قلم ہاتھ میں لیا اور پر امن زندگی کی طرف مائل کیا۔ اس افراتفری کے دور میں اختر حسین رائے پوری نے برصغیر کے تمام اردو ادیبوں سے اپنا ذہنی توازن برقرار رکھنے اور اس کے انسانی پہلوؤں پر غور کرنے کی اپیل کرتے ہوئے کہا:

> ''تاریخ کی اس کٹھن منزل میں ہمیں اپنا توازن برقرار رکھنا ہے۔ ہمیں ادب اور انسانیت دونوں سے انصاف برتنا ہے۔ فسادات ہوتے ہیں اور ان کے ذمہ دار انسان ہیں جو سکھ، ہندو یا مسلمان کے بہروپ میں نظر آتے ہیں۔ یہ اپنے مذہب اور انسانیت کے لیے باعث ننگ ہیں۔ تاہم، ہم مجاز نہیں کہ پوری قوم کو موردِ الزام قرار دے کر تاریخ کی سولی پر چڑھا دیں۔''(۱)

تقسیم ہند کے بعد اردو ادیبوں نے ہجرت، فسادات اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل کو ناول کی بہ نسبت افسانوں میں زیادہ برتا ہے۔ کیوں کہ ناول کی بہ نسبت افسانوں میں آسانی کے ساتھ وقت اور محنت کی ضرورت بھی کم تھی۔ عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، اُپندر ناتھ اشک، حیات اللہ انصاری اور خواجہ احمد عباس وغیرہ نے برصغیر کے اس سانحہ کو ایک نفسیاتی مسئلے کی حیثیت سے اپنے افسانوں میں پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

آزادی سے پہلے ہندو پاک میں ناولوں کی تعداد بہت کم تھی۔ لیکن تقسیم ہند کے بعد ناولوں کا ایک سیلاب سا آ گیا۔ فسادات اور ہجرت کے موضوع پر جتنے ناول تحریر کیے گئے، اس کی مثال کسی اور دور میں نہیں ملتی۔ ویسے تو تقسیم ہند کے موضوع پر ناول لکھنے والے ادیبوں کی لمبی فہرست ہے۔ ان میں وہ باکمال ناول

نگار جن کے فن پارے انسانی اقدار کی معنویت کے حامل ہیں، ان میں کرشن چندر کا 'میری یادوں کے چنار' [۱۹۶۰ء] 'غدار' [۱۹۶۲ء] قرۃ العین حیدر کا 'میرے بھی صنم خانے' [۱۹۴۸ء]، 'آگ کا دریا' [۱۹۵۹ء] 'آخر شب کے ہم سفر' [۱۹۷۹ء] اور 'سفینۂ غم دل' [۱۹۵۲ء]، انتظار حسین کا 'چاند گہن' [۱۹۵۲ء] اور 'بستی' [۱۹۸۰ء] خدیجہ مستور کا 'آنگن' [۱۹۸۲ء] اور 'زمین' [۱۹۸۵ء]، قاضی عبدالستار کا 'شکست کی آواز' حیات اللہ انصاری کا 'لہو کے پھول' [۱۹۶۹ء] قدرت اللہ شہاب کا 'یا خدا' [۱۹۴۸ء]، عبداللہ حسین کا 'اداس نسلیں' اور عبدالصمد کا 'دو گز زمین' وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

تقسیم ہند کے بعد ناول نگاری بھی قدرتی طور پر ایک نئے دور میں داخل ہوئی۔ تقسیم نے ملک کو ہی نہیں تخلیق کاروں کو بھی دو الگ الگ جغرافیائی خطے میں تقسیم کر دیا۔ یہ ایک المناک سیاسی حادثہ تھا۔ اس عہد کے لکھنے والوں کے یہاں اخوت اور محبت کے رشتوں کے ٹوٹنے اور بکھرنے کا عمل واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔ انسان اپنی خود غرضی اور مذہبی تعصب کے باعث نفرت کی انتہائی بلندی پر پہنچ چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان حالات سے فن کار بھی بری طرح متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ نقل مکانی، قتل و غارت گری، بھوک اور افلاس نے انسانی قدروں کو ہلا کر رکھ دیا۔ صنف نازک جس کے وجود کو تخلیق کائنات کی رنگینی تصور کیا جاتا تھا۔ جو شاعری اور فنون لطیفہ کا ایک اہم جزو سمجھی تھی۔ وہ دہشت و بربریت اور انسانی ہوس کا شکار ہو کر خون کے آنسو رونے پر مجبور ہو گئی۔ اس عہد کا ادب آگ اور خون کی اس ہولی کا چشم دید گواہ بن کر ابھرا۔ جنسی حیوانیت نے انسان کے اندر چھپی ہوئی گھٹن کو آشکار کر دیا۔ جو بظاہر ترقی یافتہ کہلانے کے باعث کھل کر سامنے نہ آسکی۔ مگر تاریخ گواہ ہے جب یہ خونی کھیل رچایا گیا تو انسانیت کی تمام حدوں کو پامال کرتے ہوئے ظلم و ستم کا بازار بلا شرکت غیرے سرانجام دیا گیا۔

فسادات کے پس منظر میں بہت سی کہانیاں اور ناول لکھے گئے۔ وہ بالعموم تین اقسام پر مشتمل ہیں:

اول: خونیں ڈرامے سے جنم لینے والی کہانیاں ——— اس میں ظلم، بربریت، لوٹ مار اور جنسی استحصال کا ذکر ملتا ہے۔ یہ کہانیاں فکشن کے بجائے واقعاتی اور اخباری نوعیت کی تھیں۔ ان میں سنسنی خیزی پیدا کرنے کی شعوری کوشش ملتی ہے۔

دوم: ظلم اور استحصال کو مذہب کی طرح دونوں فرقوں میں برابر برابر تقسیم کر دیا گیا ہے۔ آدھا حصہ ہندوؤں کے نام اور آدھا مسلمانوں کے نام ـــــ ایسی کہانیوں میں تخلیق کار کی جانب داری واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

سوم: وقتی اور حادثاتی ہونے کے باوجود پر اثر کہانیاں ـــــ ان میں فکری دبازت اور نفسیات دروں بینی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ زندگی کی پیچیدگی کا احساس دلاتی ہیں۔

فسادات اور ہجرت کے ماسوا ایسے لوگ بھی تھے جو ان مظالم کا براہ راست نشانہ تو نہیں بنے۔ مگر اس کے بعد طویل اور مسلسل خانہ جنگی کا شکار رہے۔ عقیدے کی بنیاد پر ان پر ظلم و ستم کے نئے نئے پہاڑ توڑے گئے۔ شدت پسند مسلمانوں اور انتہا پسند ہندوؤں نے ان کا جینا دوبھر کر دیا۔ ان میں سے بہت سے تو ظلم کی چکی میں پستے ہوئے ذہنی توازن بھی کھو بیٹھے۔ اس نفسانفسی اور خود غرضی نے انسان سے محبت کرنے کا سلیقہ چھین لیا۔ تخلیقی نگاہ حقائق کا پردہ چاک کر کے ان عوامل کی تلاش کر لیتی ہے جن کے ذریعہ ایک اچھا انسان بھی کبھی ذات کے اندھیروں میں گم ہو کر دوسروں کے لیے تکلیف کا سبب بن جاتا ہے۔ حقیقت شناسی کا یہی رویہ ہے جو دوسروں کے لیے محبت اور مدد کے جذبے کو جگائے رکھتا ہے۔ ادب کا یہی وہ کارنامہ ہے جس کے دروازے اگر بند نہ کیے جائیں تو زندگی کے جہنم، محبت کی گھنی چھاؤں کے زیر سایہ جنت میں تبدیل ہو سکتے ہیں۔

عبداللہ حسین: اداس نسلیں

[۱۴/ اگست ۱۹۳۱ء-۴/ جولائی ۲۰۱۵ء]

تقسیم ہند کے موضوع پر لکھنے والوں میں عبداللہ حسین با کمال ناول نگار ہیں۔ ان کا سب سے زیادہ اہم ناول 'اداس نسلیں' [۱۹۶۳ء] ہے۔ اس میں پہلی جنگ عظیم سے لے کر تقسیم ہند تک کے واقعات او رانگریزوں کی سیاسی ریشہ دوانیوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ برطانوی سامراجی سازشوں، پنجابی کسانوں کے مسائل اور ان پر تقسیم و ہجرت کے اثرات کو خاص طور پر نشان زد کیا گیا ہے۔ اس کے پلاٹ کی وسعت برصغیر کے پیچیدہ معاشی صورت حال کی ترجمانی کے ساتھ غیر منقسم ہندوستان کے سماجی اور ثقافتی ماحول کو بھی دَرشاتی ہے۔

'اداس نسلیں' جب پہلی مرتبہ شائع ہوا تو ناشر اور مصنف دونوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ ناول مارکیٹ میں آتے ہی ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ بہت کم مدت اس کے کئی ایڈیشن ختم ہو گئے۔ اس ناول کو نہ صرف قومی بلکہ عالمی سطح پر بھی مقبولیت اور پذیرائی ملی۔ اسی نے عبداللہ حسین کو کامیاب ناول نگاروں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ انھیں اس ناول پر 'آدم جی' ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ 'اداس نسلیں' کے اٹھارہ سال بعد ان کا دوسرا ناول 'باگھ' شائع ہوا۔ یہ ناول عبداللہ حسین کو اپنے سبھی ناولوں میں زیادہ پسندیدہ تھا۔ اس کے بعد ۱۹۸۹ء میں 'قید' کی اشاعت عمل میں آئی۔ 'رات' ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا جس کے دو سال بعد ان کا ضخیم ناول 'نادار لوگ' منظر عام پر آیا۔ عبداللہ حسین دوبارہ زندگی میں 'اداس نسلیں' کی سطح کا ناول تخلیق نہ کر سکے۔ حالانکہ 'باگھ' اور 'رات' نامی ناولوں میں فکشن کی تاریخ میں کچھ نیا کرنے کی ان کی کوشش ضرور رہی، لیکن یہ ممکن نہ ہو سکا۔ معاشی، مذہبی، جنسی اور سیاسی استحصال ان کے ناولوں کا خاص موضوع تھے۔ اس کے باوجود 'اداس

نسلیں' کی اہمیت اپنی جگہ برقرار رہی۔ بقول انور سدید:

''اداس نسلیں' کی شہرت اس کی اشاعت سے قبل ہی پھیل گئی تھی اور جب تین نسلوں کی یہ کہانی جو برطانوی راج پر پھیلی ہوئی ہے۔ ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئی تو اسے متحدہ ہندوستان کا ایک نمائندہ ناول قرار دیا گیا اور اس کا موازنہ قرۃ العین حیدر کے ناول 'آگ کا دریا' سے کیا جانے لگا جو تاریخ کو ایک الگ انداز سے بیان کرتا ہے۔ اور صداقت یہ ہے کہ اس ناول نے عبداللہ حسین کو ایک دن میں ممتاز ناول نگاروں کی فہرست میں شامل کر دیا۔ پھر ان کی شہرت کبھی کم نہ ہوئی۔''(۲)

'آگ کا دریا' میں تاریخ ایک طویل دور کا احاطہ کرتی ہے۔ جب کہ 'اداس نسلیں' میں کہانی کا آغاز پہلی جنگ عظیم سے ہوتا ہے اور روشن آغا کے حوالے سے کہانی آگے بڑھتی ہے۔ اس میں بھی اہم ترین کردار وقت اور تاریخ کے اسیر ہیں۔ یہ ناول قاری کے شعور کو جھنجھوڑتا ہے اور دانشورانہ کرب [Intellectual Agony] میں مبتلا کرتا ہے۔

ناول کے نام اور موضوع سے ہی واضح ہوتا ہے کہ ناول تاریخی ادوار سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ دور ۱۹۱۳ء سے ۱۹۴۷ء کو محیط ہے۔ ناول میں ایک گاؤں روشن پور کو لیا گیا ہے۔ ان کے ساتھ اس دور میں کیا کچھ ہوا۔ خواہ غربت ہو جنگ عظیم یا تحریک آزادی۔ ان حالات نے لوگوں پر کیا اثرات مرتب کیے۔ انگریزوں کی غلامی اور فسادات نے اعصابی تناؤ کا شکار 'اداس نسلیں' پیدا کیں اور یہی ناول کا موضوع ہے۔

عبداللہ حسین کا ناول 'اداس نسلیں' اس نسل کا آئینہ دار ہے جو تقسیم ہند کے بعد بے روزگاری سے پریشان اور خوف زدہ سیاسی و سماجی ماحول سے بے زار نظر آتی ہے۔ پہلی جنگ عظیم سے تقسیم ہند تک مختلف ادوار، معاشرے اور سماج کو ایک ساتھ پیش کیا ہے۔ ناول نگار کا خیال ہے کہ ماحول ہی انسان کی اداسی کا سبب بنتا ہے۔ ماحول کا انتشار، انسان کے ذہن کو منتشر کرتا ہے اور قوت فیصلہ کو سلب کر لیتا ہے۔ تقسیم ملک اور ہجرت کے واقعات کی پیش کش میں عبداللہ حسین نے حقیقت نگاری سے کام لیتے ہوئے درد و کرب کو جمع کر دیا ہے۔ اس ناول نے برصغیر کی نسلوں کو متاثر کیا ہے۔ تقسیم ہند کے المیہ کی نسل بھی اب بوڑھی ہو چلی ہے۔ ذیل میں 'اداس نسلیں' کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس میں مذہب کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے:

''ڈاکٹر انصاری نے بے چینی سے پہلو بدلا اور ہاتھ کو خفیف سی جنبش دی۔ تم وقت کو بہر طور تسخیر

نہیں کر سکتے۔ یہ ایک مابعد الطبیعیاتی عمل ہے۔ مذہب جادو یا ایسی کوئی چیز نہیں۔ یہ تو ایک سیدھی صاف اور مثبت قوت ہے جو ہمیشہ آگے کی طرف بڑھاتی ہے۔ بگاڑنے یا نفی کی اس میں صلاحیت نہیں۔ تم اپنی زندگی کو آج ہی سے ایک نئے ڈھب سے شروع کر سکتے ہو۔ اگر تم ماضی کو بھلا دینے پر اپنے آپ کو آمادہ کر سکو تو۔ یہ ایسا ہی ہوگا، جیسے تم ابھی پیدا ہوئے ہو۔

تو پھر مذہب کی کیا ضرورت ہے؟ نعیم نے چڑ کر پوچھا۔

مذہب؟ افوہ..... نیا انسان بننے کے لیے ایک نظریے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مذہب ہمیں وہ نظریہ مہیا کرتا ہے۔ ٹھہرو، مجھے بتاؤ۔ اب تمھارے پاس کیا ہے؟ وہ رکے، تاسف اور احساس جرم اور پشیمانی؟ اس اثاثے کے بل پر تم کیا کر سکتے ہو، کہاں تک جا سکتے ہو؟ اس بیماری ہی کا مقابلہ کر سکتے ہو؟ تم اپنی گزشتہ زندگی کے متعلق سوچتے ہو اور اسے تلف کرنے کی فکر میں ہو، حالانکہ یہ تمھارے بس سے باہر ہے۔ یہ جبھی ممکن ہے جب تم اپنا ذہن کھودو۔ تم یہ سب جانتے ہو اور مافوق الفطرت باتیں سوچتے ہو اور خطرناک حد تک تخیل پرست ہوتے جا رہے ہو۔ تم قطعی لاحاصل طور پر آہستہ آہستہ اپنے آپ کو ختم کر رہے ہو۔ اس وقت تمھیں ایک مثبت نظریے کی ضرورت ہے۔ ایسی قوت جو تمھیں اتنی تیزی سے آگے کی طرف چلائے کہ تمام پشیمانی، احساس زیاں اور سارے غیر ضروری جذبات پیچھے رہ جائیں۔

اپنے آپ کو دھوکا ہی دینا ہے۔ ڈاکٹر نعیم نے بے حد اکتا کر کہا۔

تو مذہب کو بیچ میں کیوں لاتے ہیں۔ اگر اپنے آپ کو یہی کچھ بتلانا ہے کہ دیکھو بھائی اب تک جو کچھ ہوا۔ اسے تو بھول جاؤ اور نئے سرے سے پروگرام شروع کرو۔ زندگی صحت مند نظریے سے ہی خوش گوار بن سکتی ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے تو نظریہ حاصل کرنے کی کوشش کرو، تو جناب اس میں مذہب کہاں سے آ گیا۔ یہ تو ہم محض تخیل کے بل پر یا تھوڑے سے فلسفے کی مدد سے بھی کر سکتے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ چند مادی فوائد کے لیے مذہب کو استعمال کرنا تو میرے خیال میں.....

ڈاکٹر انصاری خاموش بیٹھے سرخ ہوتے رہے مگر بولنے سے پہلے انہوں نے اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ میں مذہب کی اس زاویے سے تشریح کر رہا تھا جس زاویے سے تم نے اسے دیکھا۔ یہ مذہب کی ہمہ گیری ہے کہ ہم اس سے مادی فوائد بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ ورنہ مذہب تو ہمیں اس دنیا میں لے جاتا ہے جہاں اس کا تصور بھی محال ہے۔ یوں مادی فوائد سے کوئی مذہب کسی کو منع نہیں کرتا۔ لیکن اگر آپ اسے محض روحانی رہنمائی کی خاطر استعمال کرنا چاہیں تو آپ کی خوش بختی

ہے۔ مذہب کا سب سے بڑا آلہ عبادت ہے۔ عبادت جو انسان کی شخصیت سے ہم آہنگ ہو کر ایک جذبہ بن جاتی ہے۔ جو انسان کو اپنے اندر جھانکنے کی استطاعت بخشتی ہے۔ آج تک جس کسی نے اپنے آپ کو جانا اور پہچانا ہے اس کی بساط عبادت نے اس کے اندر پیدا کی ہے۔ یہ وہ راستہ ہے جس پر چلتا ہوا آدمی ساری دنیا میں گھوم گھام کر پھر اپنے آپ تک آ پہنچتا ہے۔ اسے پا لینے کی دیوانی خواہش انسان کو آگے چلاتی جاتی ہے اور اسے ایک مقصد عطا کرتی ہے اور جب وہ مقصد شخصیت کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتا ہے تو انسان اپنی ذات میں گم ہو جاتا ہے۔ پہلے شعور کے پردے اٹھتے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ لاشعور کے دَروَا ہوتے ہیں اور جب وہ آفاقی سطح پر پہنچ جاتا ہے تو ماورا کو دیکھنے اور اسے جاننے لگتا ہے۔ پھر وہ سلیمانی ٹوپی پہن کر بازاروں میں پھرتا ہے، دنیا کے ہنگاموں میں منزل منزل گھومتا ہے اور لوگ صرف ایک گمنام اور قناعت پسند آدمی کو جانتے ہیں۔ کیونکہ جو کچھ وہ دیکھتا ہے اور کوئی نہیں دیکھتا اور جو کچھ وہ جانتا ہے اور کوئی نہیں جانتا۔ اس طرح چپکے چپکے وہ زندگی کی سچائی اور اصلیت کی کھوج میں لگا رہتا ہے اور اسی کھوج میں اسے سکون مل جاتا ہے، سکون..... جو دنیا کی تمام آفتوں کے مقابلے میں ڈھال ہے۔'' (۳)

'اداس نسلیں' کا موضوع ایک فرد نہیں، بلکہ ہم عصر زندگی کے مختلف ادوار اور ان سے گزرتے ہوئے عمل اور صعوبت کے گرداب میں محصور کم از کم تین نسلوں کے نمائندے ہیں۔ عبداللہ حسین کی زندگی کا بیش تر حصہ مغربی ممالک میں گزرا۔ اس کے باوجود انھوں نے اردو ناول نگار کی حیثیت سے اپنا مقام بنایا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا مشاہدہ وسیع اور عمیق ہے۔

'اداس نسلیں' کی ابتدا پنجاب کے ایک گاؤں روشن پور سے ہوتی ہے۔ اس میں برصغیر کی تاریخ کے مختلف ادوار کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے اس کے تہذیبی پس منظر کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پہلا دور برطانوی سامراج سے متعلق ہے۔ دوسرا دور جدوجہد آزادی پر مشتمل ہے اور تیسرے دور میں تقسیم ہند کے فوراً بعد کے آنے والے واقعات و حادثات کا بیان ہے۔

برطانوی سامراج کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے عبداللہ حسین نے واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح سے جاگیردارانہ جبر و استحصال کے سائے میں پل رہے کسانوں کو جبراً انگریز فوج میں بھرتی کر کے جنگی محاذ پر لڑنے کے لیے بھیج دیا جاتا تھا۔ روشن پور کے مہندر سنگھ اور نعیم اپنے ہی جیسے لاکھوں کسان

نوجوانوں کی طرح زبردستی سپاہی بنا دیے گئے تھے۔ یہ لوگ یورپ اور افریقہ کے محاذوں پر جرمن و فاشسٹ فوجوں سے لڑتے ہوئے مارے جاتے یا اپاہج ہونے پر وطن واپس بھیج دیے جاتے تھے۔اس سامراجی جنگ میں روشن پور کے ایک نوجوان کسان نعیم نے انسانی جان کی پامالی اور بے قدری کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔اس نے اپنے قریبی دوست ٹھاکر داس کو وقت کی مجبوریوں کے تحت موت کے منہ میں جاتے ہوئے اور اپنے ساتھی بندر سنگھ کو لڑنے سے انکار کرنے پر انگریز کمانڈر کے ریوالور سے مرتے ہوئے دیکھا تھا۔

ناول کے دوسرے حصہ میں عبد اللہ حسین نے ہندوستانی کسانوں کی مایوس زندگی، بے مصرف محنت، جنگ کی تباہ کاریوں، جاگیرداروں کے جبر واستحصال اور مہاجنوں کے لوٹ کھسوٹ کو بڑے مدلل انداز میں پیش کیا ہے۔کس طرح کسان کی زندگی بے بسی کا شکار رہتی ہے۔اس کی پوری زندگی کی محنت نہ تو اس کے سماجی وقار میں کسی طرح کا اضافہ کرتی ہے۔نہ ہی اس کی زندگی میں کسی تبدیلی کا باعث ہوتی ہے۔اس ناول میں عبداللہ حسین نے کسانوں کے ساتھ ساتھ اعلیٰ طبقے کے ذریعہ اچھوتوں کے ساتھ ہونے والے ظلم و جبر کو بھی موضوع بنایا ہے۔صنعتی نظام کی ریڑھ کی ہڈی کہی جانے والی مل اور فیکٹریوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی محرومیوں اور ناآسودگیوں کو بھی تفصیل سے پیش کیا ہے۔پریم چند کے 'گئودان' کے بعد 'اداس نسلیں' اردو کا پہلا ناول ہے جس میں اتنے بڑے کینوس پر گاؤں کے باشندوں کے روزمرہ کے دکھ درد، جان توڑ محنت اور سماج کی اندھی قوتوں کے سامنے سینہ سپر رہنے کی قوت کو پیش کیا گیا ہے۔

ناول کے آخری حصے میں عبداللہ حسین نے تقسیم ہند سے متعلق واقعات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ہجرت وفسادات کے سمندر سے گزرنے والوں کی ذہنی ونفسیاتی کیفیات، راستے کی مصیبتیں، جان و مال کے نقصانات وغیرہ فن کارنہ انداز اور نفسیاتی بصیرت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

'اداس نسلیں' میں نعیم مرکزی کردار ادا کرتا ہے جو روشن پور گاؤں کے ایک خوش حال کسان کا بیٹا ہے۔جنگ عظیم میں انگریز حکومت کے ذریعہ بہادری کا تمغہ 'وکٹوریہ کراس' حاصل کرنے اور روشن آغا کی بیٹی کے نکاح میں آجانے سے نعیم کو وہاں کے معاشرے میں عزت واحترام حاصل ہوجاتا ہے۔جنگ آزادی میں کانگریس کے بینر تلے پرامن جدوجہد میں بھی شریک ہوتا ہے۔حالات کی پیچیدگیوں نے نعیم کو پاکستان

ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا۔نعیم بڑھاپے کی طرف مائل تھا اور اس کی زندگی میں آسائش کے تمام وسائل مہیا تھے۔لہٰذا وہ راستے کے غم والم اور تکلیف ومصائب کا سامنا نہ کر سکا اور جاں بحق ہو گیا۔

نعیم ایک مخصوص فرد ہے اور انفرد یت کا ایسا ہی مالک ہے جیسا کہ خاص آدمی ہوتا ہے۔اپنی تمام تر انفرادیت کے باوجود وہ ایک نمائندہ کردار بھی ہے۔ایک سمبل ہے،ایک اشارہ ہے،ایک ایسا انسان ہے جو زندگی میں مرجاتا ہے اور مر کر زندہ ہو جاتا ہے۔جب تک وہ زندگی میں موت سے ہم کنار رہتا ہے اس کا بھائی علی اس سے منحرف اور برگشتہ رہتا ہے۔لیکن اس کی موت کے بعد علی،نعیم کی اولاد معنوی کے روپ میں زندہ رہتا ہے اور بٹوارہ کے بعد قافلہ کے ساتھ پاکستان آتے ہوئے نعیم سے وہ سب کچھ حاصل کر لیتا ہے جو نعیم نے زندگی کے تجربات کی صورت میں اکٹھا کر رکھے تھے۔پاکستان میں علی ایک نئی زندگی شروع کرتا ہے اور وہ شیلا کو اپنی رفیق حیات منتخب کرتا ہے۔اس طرح گویا نعیم حیات کی تجدیدی قوتوں کا نشان بن کر علی کے روپ میں منفی اقدار سے مثبت اقدار کی طرف رجعت کرتا ہے۔

نعیم کا کردار ایک ققنس کی مانند زندہ وجاوید کردار ہے۔ققنس درحقیقت کبھی نہیں مرتا جب وہ بوڑھا ہو جاتا ہے تو دیپک راگ چھیڑ دیتا ہے اور اس کی منقار سے چنگاریاں برستی ہیں۔یہاں تک کہ وہ جل کر ایک مشت خاک میں بدل جاتا ہے۔اسی مشت خاک سے دوسرا ققنس جنم لیتا ہے۔اس طرح حیات کا تسلسل نہ صرف قائم رہتا ہے بلکہ زندہ قوتوں کا نمو ہونے لگتا ہے اور تجدید حیات ہوتی ہے۔نعیم اور علی کے کرداروں کا تضاد اور مشابہت درحقیقت مصنف کی تخلیقی قوتوں کی نشان دہی کرتے ہیں۔اس مقام پر مصنف نے دراصل زبردست کامیابی حاصل کی ہے۔یہ کہنا بھی غلط نہیں ہوگا کہ اس ناول کی عظمت کا دارومدار نعیم اور علی کے کرداروں پر ہے۔

عذرا کے کردار کی تشکیل اور اس کی نمو میں مصنف بری طرح ناکام ہوا ہے۔خاص طور پر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ عذرا جو اس ناول کے ابتدا میں روشن محل کے ایک مخصوص پیڑ کی شاخ پر بیٹھ کر قہوہ پیتی ہے۔اس عذرا سے مختلف ہوتی ہے جو نعیم کی بیوی کے طور پر ناظرین کے سامنے آتی ہے۔عذرا کے بارے میں یہ احساس تو ضرور ہوتا ہے کہ وہ نعیم پر کسی نہ کسی طرح قابو حاصل کر لیتی ہے۔یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ وہ

نعیم کو بربادی کے راستے پر بھی لے جانے کی ذمہ دار ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ عذرا پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا کیونکہ نعیم درحقیقت عذرا کے سامنے تباہ کن احساس کمتری میں مبتلا دکھائی دیتا ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ نعیم اس جھینپ کو کبھی دور نہ کر پایا جو اس نے اپنی ٹوپی کے پھندنے میں محسوس کی تھی، جو بار بار اس کی پیشانی پر گر جاتا اور جس کے بارے میں عذرا نے ہلکا سا اشارہ کر کے اس کو لال لال کر دیا تھا۔ نعیم روشن محل کے ہجوم سے اپنے آپ کو کبھی ہم آہنگ نہیں کر سکا اور یہی اس کی بربادی کا سبب ہے۔ ناول کے آخری حصے [تقسیم کے بعد] میں مصنف نے قارئین پر عذرا کی عظمت کا احساس مسلط کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ بات ناول کے واقعات سے ظاہر نہیں ہوتی۔ عذرا کے کردار میں ایک طرح کی رومانیت ہے۔ تاہم عذرا کے کردار میں کچھ باتیں ایسی ضرور ہیں جو اس کو دل کش بنا دیتی ہیں۔ اس طرح وہ مخصوص نسوانی فطرت کی نمائندہ بن جاتی ہے۔ لیکن یہ نسوانیت شہری لڑکیوں کی بنیادی رومانیت پسندی کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ عذرا نے اکثر موقعوں پر قوت فیصلہ کی کمی کا ثبوت دیا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ اس کے پاس قوت ارادی کی افراط کے ساتھ قوت فیصلہ کا زبردست فقدان ہے۔

نعیم اور عذرا کی جنسی زندگی غیر فطری ہے۔ شاید نعیم کے احساس کمتری کے علاوہ یہ خصوصیت بھی ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا رکھنے کی ذمہ دار ہے۔ عذرا کے مقابلہ میں شیلا کا کردار جھوٹی عظمت سے خالی ہونے کے باوجود جیتا جاگتا کردار ہے۔ نعیم 'لکڑ بند' ہونے کے باوجود شیلا کے سامنے کسی قسم کا احساس کمتری نہیں محسوس کرتا۔ گو عذرا سے شادی کے باوجود پوری عمر اسے حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ لیکن شیلا کو وہ بغیر شادی بیاہ، پلک جھپکنے میں فتح کر لیتا ہے۔ شیلا کے مقابلہ میں وہ ایک مکمل مرد دکھائی دیتا ہے۔ وہ مرد جو ابھی تک ماقبل تاریخ کے انواع کی خصوصیات کا حامل ہے۔

ناول میں وہ شیلا سے فرار اختیار کر کے عذرا کی رومانیت میں پناہ لینے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن حقیقت میں اس کا جسم، اس کی روح اور اس کا وجود شیلا کا طلب گار رہتا ہے۔ عبداللہ حسین نے پلاٹ کی تشکیل میں جس فن کاری سے کام لیا ہے۔ وہ اس لیے قابل تعریف ہے کہ شیلا سے گریز کرنے کے باوجود نعیم، علی کی شکل میں دوبارہ اس کو حاصل کر لیتا ہے۔ علی اور شیلا ایک بار پھر ایک نئے خاندان کی بنیاد ڈالنے کی کوشش شروع کرتے ہیں۔ گویا شیلا جو نعیم کو اپنا سب کچھ لٹانے کے باوجود بھی حاصل نہیں کرتی، بالآخر علی کی شکل میں حاصل کر لیتی

ہے۔اس طرح ناول کا پلاٹ حیران کن انداز میں ایک مکمل اکائی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

نعیم کے والد نیاز بیگ کا کردار بھی حقیقت پسندانہ انداز میں نہایت کامیابی کے ساتھ تراشا گیا ہے۔قاری کے ذہن میں نیاز بیگ حقیقی اور زندہ انسان کا روپ دھار لیتا ہے۔تاہم اس کی دو بیویوں کا مسئلہ غیر ضروری محسوس ہوتا ہے۔

روشن آغا کی تصویر کشی ناول کی ابتدا میں بہت جان دار ہے لیکن بعد میں ان کی جھلکیاں مدھم معلوم ہوتی ہیں۔بٹوارہ کے دوران میں ان کا پیدل سفر قابل تعریف ہے۔کیونکہ اس طرح ان کا کردار جامد ہونے سے بچ جاتا ہے۔ناول کے آخر میں ان کے بیٹے کا ان سے مصلحت آمیز برتاؤ ایک تلخ حقیقت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔اس تلخی کا سبب وہ عظیم تغیر ہے جو تقسیم ہند کے بعد فسادات کے ڈرامہ کا آخری ایکٹ بن کر نمودار ہوتا ہے۔بیشتر کردار ناول کے پلاٹ پر اثر انداز ہوتے ہیں۔یعنی ان کا تعلق کسی اہم یا غیر اہم واقعہ سے ہوتا ہے اور اس واقعہ کے ساتھ ہی ابھرتے اور ڈوب جاتے ہیں۔اس سے واقعات کا تسلسل اور بہاؤ کا احساس قوی تر ہو جاتا ہے۔

جہاں تک فسادات کے دوران میں مصیبت زدہ انسانوں کا ہندوستان سے پاکستان کی طرف ہجرت کی تفاصیل کا تعلق ہے عبداللہ حسین نے اس معاملے میں فن کاری کا لوہا منوا لیا ہے۔ناول کے اس حصہ میں ہمیں زندگی میں موت اور موت میں زندگی کا احساس ملتا ہے۔خاص طور پر مہندر سنگھ اور نعیم کی ملاقات اس احساس کو مرتب کرنے میں کافی حد تک کامیابی کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔

دہلی سے نعیم جس قافلہ میں شریک ہوا۔وہ قافلہ دن بدن لمبا ہوتا جا رہا تھا۔اس وجہ سے افواہیں بھی زیادہ کام کر رہی تھیں۔کسی زبان سے نکلا ہوا لفظ، دوسرے سرے تک پہنچتے پہنچتے سارے راستے کی تھکن اور بھوک پیاس پر دہشت بن کر سوار ہو جاتا ہے۔ہمراہیوں کے قتل عام اور حملہ آوروں کی بربریت کو نعیم نے بہت قریب سے دیکھا تھا۔یہ وہ دور تھا جب انسانیت مر چکی تھی۔اپنے ہی ظالم تھے اور اپنے ہی مظلوم۔چہروں اور عقیدوں کا فرق مٹ چکا تھا۔رحم دلی اور رواداری آسمانی فضاؤں میں گم ہو چکی تھی۔قومی جنون نے اپنے ہی بھائیوں کے ساتھ وحشی درندوں سے بدتر سلوک کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔قافلوں پر ہونے والے بار

بار حملے اور حملے کے بعد کی کیفیت کی عکاسی عبداللہ حسین نے بڑے ہی فنی مہارت کے ساتھ اس پیرائے کے اندر بیان کیا ہے:

''قافلے کا حجم حیرت انگیز طور پر گھٹتا جا رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جوں جوں وہ پنجاب کے اندر آتے گئے، حملوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ پچھلے پانچ روز سے دن میں کئی کئی بار حملے ہو رہے تھے۔ اور وہ ایک پل کے لیے بھی بے خبر ہو کر نہ چل سکتے تھے۔ یہ حملے مسلح اور نیم مسلح دستوں کی طرف سے ہو رہے تھے۔ جو کہ زیادہ تر دیہات سے آتے۔ پہلے پہل تو قافلے والے کچھ نہ کچھ ان کا مقابلہ کرتے رہے۔ لیکن اب وہ اس قدر تھک چکے تھے کہ حملہ آوروں کے ہتھیاروں کے سامنے خاموشی سے مر جاتے یا بھاگنے لگتے .... بعض دفعہ اگلے قافلے کے حملہ آور انھیں بغیر کچھ کہے گذر جانے دیتے۔ وہ مار مار کر اس قدر اکتا چکے ہوتے کہ محض سڑک کے کنارے بیٹھے نئے قافلے کے خاموش خوف زدہ کوچ سے ہی محظوظ ہوتے رہتے۔ کبھی کبھی وہ مردوں اور زخمیوں کو ایک جگہ اکٹھا کر کے آگ لگا دیتے اور نیا قافلہ چپ سادھے بھاگتا ہوا ان کے قریب سے گذر جاتا۔''(۴)

ہجرت کے اس جانکاہ سفر میں عورتوں کا استحصال اور ان کے جسموں کی پامالی بھی عروج پر تھی۔ عام طور پر لڑکیوں اور عورتوں کے ساتھ دنگائی اجتماعی عصمت دری کر کے یا بے یارو مددگار جنگلوں میں چھوڑ کر چلے جاتے۔ کچھ ایسے بھی لوگ تھے جو اشیائے خوردنی کے بدلے اپنے ہی قافلے کی عورتوں کی عزت سے لذت یاب ہوتے۔ سودے بازی قافلوں کے اندر عام بات ہو چکی تھی۔ نعیم جو اس ناول کا مرکزی کردار ہے۔ اپنے قافلے پر گذرنے والی ہر مصیبت اور قافلے میں ہونے والی ہر موت، ہر حرکت اور ہر پڑاؤ کا خود ہی چشم دید گواہ تھا۔ وہ اس سفر میں خود سے بے گانہ ہو کر نیم دیوانگی اور نیم مدہوشی کی حالت میں اس سانحہ کا مشاہدہ کر رہا تھا جو ہجرت کی شکل میں انجام پا رہی تھی۔

آزادی کے بعد ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات اور ہجرت کے مناظر کے ساتھ ناول اختتام کو پہنچتا ہے۔ 'آگ کا دریا' کے بعد اسی ناول میں ہندوستان کی سیاسی صورت حال، تقسیم ہند کا سانحہ، سماجی و ثقافتی زندگی کو بڑے حیرت انگیز اور فنی مہارت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ان ہی سب خوبیوں کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر نورالحسن نقوی ایک مقام پر لکھتے ہیں:

''آگ کا دریا' کے بعد اردو کا سب سے اہم ناول 'اداس نسلیں' ہے۔ جس میں مصنف نے جا بجا حیرت انگیز فنی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ اس کی کہانی پہلی عالمی جنگ سے ذرا پہلے شروع ہو کر ملک کے بٹوارے کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ ہندوستان کی تاریخ کا یہ دور کئی لحاظ سے بہت اہم اور عہد آفریں تھا۔ ۳۵ سال کے مختصر عرصے نے ہندوستان میں بہت کچھ دیکھا۔ دو جنگیں اور ان کے بھیانک نتائج، جدید تعلیم اور مغربی تہذیب کی دی ہوئی لعنتیں اور برکتیں۔ پرانی قدروں کا زوال، سرمایہ و محنت کی کشمکش، سر اٹھاتا ہوا کسان اور مزدور، جدوجہد آزادی، ہندو مسلم اتحاد و اختلاف، مسلم لیگ اور کانگریس کی رقابتیں، ملک کا بٹوارہ، بھیانک فسادات اور نامساعد حالات میں جنم لینے والی اداس نسلیں جو بالآخر اپنے وطن میں بے وطن ہو جاتی ہیں۔'' (۵)

عبداللہ حسین کے ناولوں میں خواتین جس طرح جلوہ گر ہوتی ہیں، وہ انھیں قدرے منفرد بنا دیتا ہے کیوں کہ ان کے متعلق کوئی بھی نہیں جانتا کہ وہ اگلے لمحے کیا کرنے والی ہیں، کدھر کو جانے والی ہیں اور کیا کہنے والی ہیں۔ 'اداس نسلیں' کی 'عذرا'، 'باگھ' کی 'یاسمین'، 'قید' کی 'رضیہ' اور 'نادار لوگ' کی 'سکینہ' یہ سب اپنی سوچ اور رویے کے حوالے سے عجیب و غریب لڑکیاں ہیں۔ عورتوں کے حوالے سے عذرا کہتی ہے کہ عورتیں بے شرم نہیں ہوتیں، لیکن محبت ضرور کرتی ہیں۔ عذرا خود ہمت اور جسارت کا نمونہ ہے اور ہمیشہ پر عزم لہجے میں بات کرتی ہے۔ اس کی شادی بھی محض اس کی قوت ارادی کے بل بوتے پر ہوتی ہے۔ عبداللہ حسین کے ناولوں کی مرکزی عورت بڑی با حوصلہ اور طاقت و قوت سے بھرپور ہوتی ہے۔ ایسی عورت جب بلند سطح سے اتر کر ایک عام آدمی کو اپنا جیون ساتھی بنائے گی تو اس کی سوچ اپنی بیوی کے لیے وہی ہوگی جو 'اُداس نسلیں' کے نعیم کی ہے:

''وہ بے شرمی کی حد تک نفسانی اور خوب صورت تھی اور محبت کرنے والی تھی۔ وہ بیہودہ عورت تھی۔ وہ اونچے طبقے کی عورت تھی۔ وہ برتر تھی۔ وہ تہذیب و تمدن کی عورت تھی۔ وہ ایک نکما مرد تھا۔ نکما اور نادار۔ معمولی بے حد معمولی۔'' (۶)

ہمارے معاشرے میں مرد کسی بھی حوالے سے عورت سے کم نہیں ہونا چاہتا۔ اگر شکل و صورت یا تعلیم و تربیت میں وہ اپنے شوہر سے آگے ہو تو اس کے مجازی خدا بننے کے چانس کم ہو جاتے ہیں۔ جسے وہ اپنی توہین سمجھتا ہے۔ ڈاکٹر حسن اختر اپنے مضمون 'اداس نسلیں' میں لکھتے ہیں:

''عذرا اگر چہ جاگیردار طبقے ہی کی پیداوار ہے، لیکن وہ امیر اور غریب کے امتیاز کو محبت پر قربان کر دیتی ہے۔ وہ ایک وفادار عورت ہے جو نعیم سے آخری دم تک محبت کرتی ہے۔ اس کی شخصیت میں ایک وقار ہے، لیکن وہ نعیم کے لیے ایک ساحرہ ہے۔''(۷)

دراصل ادھیڑ عمر اور بڑھاپے کی طرف گامزن ہوتے ہوئے مرد کو اپنی بیوی کے چمکیلے جوان جسم سے نفرت ہو جاتی ہے۔ شوہر کی جذباتیت کا شکار ایک عورت جو خود بھی بیمار اور شکست خوردہ نسل کے زمرے سے تعلق رکھتی ہو آخر کار نا آسودگی، محرومی اور ذہنی تشنج کا شکار ہو جاتی ہے۔ جس کی مثال عذرا ہے۔ اس کردار کے بارے میں انور پاشا لکھتے ہیں:

''عذرا جاگیردار طبقے کی تعلیم یافتہ اور روشن خیال لڑکی ہے اور مشرقی اقدار و آداب کی پابند بھی۔ لیکن اس کی حیثیت اس معاشرت اور نظام میں مرد کی تکمیل کا ایک ذریعہ محض کی طرح معلوم ہوتی ہے۔''(۸)

عذرا مرد کی تکمیل کا ذریعہ محض اس لیے نہیں ہے کہ وہ جاگیردار طبقے کی تعلیم یافتہ اور روشن خیال لڑکی ہے۔ بلکہ عبداللہ حسین کے ناولوں میں عورت کا یہ وصف سامنے آتا ہے کہ وہ نہ صرف مرد کی تکمیل کا باعث ہیں، بلکہ محبت کے حوالے سے بھی زیادہ متحرک اور فعال ہیں۔ ان کے ہاں عورت اپنے محبوب سے بے تحاشا محبت کرتی ہے۔ وہ اپنی محبت کی انتہا کو پہنچتی ہے لیکن اپنی قسمت اور بے گھری سے خوف زدہ ضرور ہے، جس کی مثال عذرا اور یاسمین ہیں۔

''اسدی یہ مجھے معلوم ہے کہ تمھارے بغیر میں مر جاؤں گی۔ یہ سیدھی سی بات ہے مگر تمھارے ساتھ میں کس طرح رہوں گی، اس کی مجھے خبر نہیں۔''(۹)

عبداللہ حسین کے ناولوں میں عورت کی کوئی غیر مرئی شبیہ نہیں جو اپنے محبوب کے ہاتھ نہ آئے۔ بلکہ وہ ایک ٹھوس بدن رکھنے والی ایسی عورت ہے جو اپنے محبوب پر اپنے بدن کے اسرار کا انکشاف کرتی ہے اور اپنی بے تابیوں کا برملا اظہار بھی کرتی ہے۔ ان کے ناول 'باگھ' کی یاسمین ایسی ہی عورت کی ہلکی پھلکی تصویر ہے جو مرد کے اندر ایک ایک نقطے کو چھوتی ہوئی پرواز کرتی ہے اور ایک بے نام سے نیم روشن جذبے کی صورت اپنے محبوب کو مشکل ترین وقت میں سنبھالے رکھتی ہے:

''تمھیں پتا ہے تمھارے بعد میرا دل فنا ہوجاتا ہے۔ جب تم پولیس کی قید میں تھے تو میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوگئی تھیں۔ چمگادڑوں کی طرح میں رات بھر آنکھیں کھولے دیکھتی رہتی تھی اور میرے دل میں کوئی خیال بھی نہ آتا تھا۔ میں کوشش کرتی تھی کہ مجھے میرے بچپن کی کوئی بات یاد نہ آئے۔ پتہ چلے کہ میں زندہ ہوں۔ مگر ایک بات بھی یاد نہ آتی تھی۔ میرا حافظہ ٹھہر گیا تھا۔ ایسی حیران کر دینے والی بات تمھاری سمجھ میں کیسے آئے گی..... میرا پیٹ 'اس نے ایک خشک سسکی بھری' سوکھ گیا تھا۔'' (۱۰)

ایک عورت کا درد مرد کے لیے سرخوشی اور توانائی کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ عبداللہ حسین کے ناولوں کی عورت محبوب سے زیادہ عاشق کے روپ میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ ان کی عورت میں وارفتگی اور شدت مرد مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے۔ 'باگھ' کی یاسمین میں عورت کی یہ شدت اور بے قراری نمایاں ہوکر سامنے آتی ہے:

''اسد کے بدن کو اس نے چاروں ہاتھوں پاؤں سے ڈھانپ لیا اور اسے چومنے لگی۔ اس کے سر کو، ماتھے کو، آنکھوں کو، ہونٹوں کو اور ٹھوڑی کو۔ اس کی گردن کے خم میں سینے پر پسلیوں کی باریک جلد کے اوپر، ناف کے اندر، گھٹنوں اور ٹخنوں کو چومتی ہوئی وہ پاؤں کے تلوؤں پر چلی گئی۔ میرے پاس رہو۔ وہ رو کر بولی، اسدی۔'' (۱۱)

یاسمین جیسی عورت کسی بڑے شہر کی یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم یافتہ انٹلیکچول نہیں جو اپنے دکھ اور کرب کا اظہار بھی ایک خاص رکھ رکھاؤ اور تصنع و بناوٹ سے کرے۔ وہ دور افتادہ دیہات کی تقریباً اَن پڑھ دوشیزہ ہے جو محبت کا مفہوم کتابوں سے نہیں جسمانی قربتوں کی گرم آنچ سے محسوس کرتی ہے۔

عذرا اور یاسمین کی بجائے 'قید' کی رضیہ سلطانہ کا کردار حقیقت سے بعید نظر آتا ہے۔ لیکن ایسی عورت کے اسرار میں مرد کھو جاتا ہے۔ رضیہ سلطانہ دوہری شخصیت رکھنے کے ساتھ ساتھ عورتوں کے ان خیالات کی ترجمان ہے، جو وہ حقیقی زندگی میں کسی کے سامنے کہنے کی جسارت نہیں کر سکتیں۔ مثلاً وہ فیروز شاہ سے محبت تو کرتی ہے مگر اس سے شادی کے لیے رضامند نہیں ہوتی اور اس کی توجیہ اس طرح پیش کرتی ہے:

''ساری دنیا کا درد دل میں لیے پھرتا تھا۔ جب میرے پاس آتا دو منٹ میں لڑھک جاتا اور منہ پرے کیے خراٹے لینے لگتا تھا۔ جیسے میں کوئی حیوان ہوں یا کوئی پتھر کی سل ہوں جس پر رگڑ کر چٹنی بنائی، کھائی اور پرے کھڑی کر دی۔ میں آدم زاد ہوں حیوان نہیں ہوں۔'' (۱۲)

رضیہ سلطانہ کے حوالے سے معاشرے میں عورت کے مقام کو پیش کیا گیا ہے جس کا کہنا ہے کہ مرد جب عوام کی تعریف کرتا ہے تو اس سے مراد عام لوگ یعنی غریب لوگ ہوتے ہیں۔ اس میں ریڑھی والا، تانگے والا، رکشہ چلانے والا، چپڑاسی، کلرک، غریب دوکان دار، فیکٹری کا مزدور، غریب کسان، مال ڈھونے والا، برتن قلعی کرنے والا، اسٹیشن کا قلی، ڈاکیہ، بس ڈرائیور، پھیری لگانے والا، لوہا کوٹنے والا، بجلی کا میٹر پڑھنے والا، کرسیاں بنانے والا، پولیس کا سپاہی، چارپائیاں بنانے والا یہ سبھی شامل ہیں۔ مگر ان سب میں وہ عورتوں کو شامل نہیں کرتا۔ کیا عوام میں عورتیں شامل نہیں؟ عورتیں جو احساس کمتری لے کر پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً کوئی ہاتھ لگا جائے تو دوسرے کے منہ کی طرف دیکھتی ہیں۔ مردوں کے منہ پر بال نکلتے ہیں تو فخر سے دنیا کو دکھاتے ہیں۔ عورت کے منہ پر ایک بال اُگ آئے تو شرم سے سر جھکا لیتی ہے۔ اس کی چھاتیاں نکلتی ہیں تو شرم سے دوپٹہ سینے پر ڈالے رہتی ہے۔ شادی کی رات گزرتی ہے تو شرم سے باہر نہیں نکلتی۔ اس سے بڑی 'غربت' اور کیا ہو سکتی ہے۔

درحقیقت عبداللہ حسین کے ناولوں میں عورت کا جو تصور سامنے آتا ہے، وہ غیر معمولی ہے۔ ان کے ہاں عورت کا ذہنی معیار عام عورت سے قطعی مختلف ہیں۔ ان کی عورت حقیقی ماحول میں غیر فطری رویہ اپناتی ہے۔ اس لیے عام طور پر وہ قاری کی ہمدردیاں حاصل نہیں کر پاتی۔ وہ سوچتی اور پھر اچانک فعال ہوتی نظر آتی ہے۔ لیکن پھر جلد ہی اپنی حد میں مقید ہو جاتی ہے۔ اس لیے وہ زندگی میں بھرپور جدوجہد کرتی ہے، تاہم منزل تک نہیں پہنچ پاتی اور راستے ہی میں دم توڑ دیتی ہے۔ یہ عورت 'اداس نسلیں' میں عذرا، 'قید' میں رضیہ سلطانہ اور 'نادار لوگ' میں سکینہ کے روپ میں سامنے آتی ہے۔

عبداللہ حسین کے ناولوں میں مرد عورت کا حق ادا نہیں کر پاتا۔ وہ عورت کو صرف جنسی آلۂ کار بناتا ہے۔ لیکن اسے اپنی زندگی کے لیے اہم نہیں گردانتا۔ یہی وجہ ہے کہ 'اداس نسلیں' کا ہیرو نعیم، عذرا سے کھنچا کھنچا رہتا ہے۔ اسی طرح 'باگھ' کا اسد، یاسمین سے محبت تو کرتا ہے مگر اس کے لیے سب کچھ کر گزرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ ان کے ہاں مرد عورت سے سپردگی چاہتا ہے اور اسے اپنی ملکیت سمجھتا ہے۔ اس کی جوانی اور خوبصورتی سے فیض یاب ہوتا ہے۔ مگر اس کے لیے فنا نہیں ہوتا۔ ان کے ناولوں کی عورت کو دیکھتے ہوئے لگتا ہے کہ وفاشعاری، قربانی اور سپردگی کا اس کے لیے اس دنیا میں کوئی انعام نہیں ہے۔

بعض ناقدین نے ناول میں فنی نقص کی جانب اشارہ کیا ہے۔حسن اختر اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''ناول کا پلاٹ کمزور ہے۔ یہ مربوط نہیں زندگی اور ناول میں فرق ہے جسے ناول نگار نے نظر انداز کر دیا ہے کئی ضمنی کہانیاں ہیں جو غیر ضروری ہیں مثال کے طور پر مچھلی والے کا طویل قصہ جو کہانی کے مرکزی تاثر میں اضافہ کرنے میں کوئی مدد نہیں دیتا...عبداللہ حسین نے ڈاکٹر اور انیس الرحمٰن کے کردار تو محض تقریریں کرنے کے لیے تخلیق کیے ہیں ناول کے یہ حصے خاصے بور ہیں اور دلچسپی کی پری اپنا دامن چھڑا کر پرواز کر جاتی ہے۔''(۱۳)

اس کے باوجود 'اداس نسلیں' کی اہمیت برقرار رہتی ہے۔

انتظار حسین: چاند گہن/بستی

[۲۱/ دسمبر ۱۹۲۵ء-۲/فروری ۲۰۱۶ء]

انتظار حسین نے ہندوستان کی کلاسیکی فضا میں ہوش سنبھالا۔ تقسیم ہند کے موقع پر ہجرت کے تجربے سے گزرے۔ لاہور میں عارضی قیام مستقل سکونت میں تبدیل ہوگیا۔ افسانہ نگاری میں 'کرشن چندر' سے ابتدائی اثرات قبول کیے، تدریس میں اپنے استاد پروفیسر کرار حسین کا اثر لیا۔ زندگی کو تخلیق کی طرح بسر کرنے والے نے دوست ان کو بنایا جن کی صحبت بھی اپنی تاثیر رکھتی تھی۔ ناصر کاظمی، حنیف رامے، نیاز احمد جیسے ہنرمندوں سے گہرے مراسم ہوئے۔ کہانی کہنے کے فن پر انتظار حسین نے ملکہ حاصل کیا اور ان کے ان سب دوستوں نے بھی اپنی جداگانہ تخلیقی جہتوں میں فتح کے جھنڈے گاڑے۔ انتظار حسین نے کئی نسلوں کے زیرِ سایہ علمی تربیت حاصل کی اور پھر کئی نسلوں تک اس علم کو اپنی گفتگو اور کتابوں کے ذریعے منتقل کیا۔ انہوں نے داستان گوئی کے قدیم اسلوب کو اپنی کہانیوں کے ذریعہ از سرِ نو زندہ کیا۔ وہ کہانی لکھنے کے بجائے اسے 'سناتے' ہیں۔

انتظار حسین اردو کے ایسے تخلیق کار ہیں جن کے تمام ناول کسی نہ کسی شکل میں تقسیم، ہجرت اور ان سے پیدا شدہ انسانی مسائل کو بیان کرتے ہیں۔ ان کے ناولوں میں 'چاند گہن' [۱۹۵۲ء]، 'دن اور داستان' []، 'بستی' [۱۹۸۰ء]، 'تذکرہ' [] اور 'آگے سمندر ہے' [] شامل ہیں۔ آخری ناول 'سنگھاسن بتیسی' [۲۰۱۴ء] میں شائع ہوا۔ ہجرت کے زخم، ماضی کی یادیں، تاریخ کے نقوش، دیومالائی داستانوں کے کردار اور بے ہنگم جدید دور کی خواہشات ان کے فکشن کا موضوع ہیں۔

انتظار حسین ہندوستان کے جاگیردارانہ نظام کی باقیات اور تہذیب کے پروردہ تھے۔ انتقال آبادی

اور ہجرت کے عمل کے باعث وہ بھی دیگر مہاجرین کی طرح نہ صرف سابقہ رشتوں سے محروم ہو گئے۔ بلکہ مصائب و مسائل کے ہجوم نے انھیں اپنی گرفت میں لے لیا۔ یہاں تک کہ ہجرت کا واقعہ ان کی زندگی کا سب سے بڑا تجربہ بن گیا۔ تجربے کی اس شدت اور صداقت نے اس واقعے کو ان کے فکر و فن کی اساس بنا دیا ہے۔ جس کے نقوش ان کے ناولوں میں اس قدر گہرے اور ہمہ گیر ہیں کہ ہر واقعہ اس تجربے کا براہ راست اظہار یا اس سے پیدا شدہ حالات و افکار کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ ناولوں کی مجموعی فضا، مایوسی، گھٹن اور اضمحلال سے لبریز ہے۔ جو پڑھنے والے پر خاص اثر ڈالتی ہے۔ سید علی حیدر لکھتے ہیں:

> ''فسادات کے ماحول میں افواہوں کی گرم بازاری، دہشت انگیزی، ناخواندہ عورتوں کی توہم پرستی کے سائے، قاری کے ذہن پر مقناطیسی اثر ڈالتے ہیں۔'' (۱۴)

چاند گہن (اشاعت: ۱۹۵۳ء):

'چاند گہن' ان کا پہلا ایسا ناول ہے۔ اس میں مہاجرین کو درپیش مسائل اور فرقہ وارانہ فسادات پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ساتھ ہی متوسط طبقے کی جہالت، ان کی ناخواندگی، عورتوں کی توہم پرستی وغیرہ کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ اس ناول کے اندر سبطین، کالے خاں، خوجی، فیاض اور حق صاحب ایسے کردار ہیں جو اپنی مٹی و معاشرہ سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ نئے وطن سے سمجھوتہ نہیں کر پاتے۔

سبطین اور فیاض خان تعلیم یافتہ ہیں۔ اپنی قوم کی اصلاح کے لیے فکر مند رہتے ہیں۔ قوم کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کا عزم کرتے ہیں۔ انگریزی روزنامے کے اجرا کے ساتھ اس سلسلے کی شروعات ہوتی ہے۔ لیکن مایوسی ہی ہاتھ آتی ہے۔ اس کے بعد ذہن اردو اخبار کی طرف جاتا ہے۔ وہاں بھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ لوگ اپنی ناکامیوں اور محرومیوں کے سبب ایک خاص قسم کے فلسفیانہ و جذباتی ردعمل کے متلاشی رہتے ہیں۔ پوری زندگی وطن سے محبت، اپنی مٹی کا درد اور اس سے جذباتی رشتے کو بھلا نہیں پاتے۔

اس ناول کا ایک اہم کردار کالے خاں پوری کہانی میں جہالت کا پیکر نظر آتا ہے۔ اسی جہالت کے سبب اس کے دل و دماغ میں ہمیشہ انتقامی جذبے کے تحت خون بہانے کا نشہ رہتا ہے۔ بالآخر کشمیر کے محاذ پر ہندوستانی فوج کے ساتھ لڑتے ہوئے وہ اپنی جان دے دیتا ہے۔

یہ تمام لوگ پاکستان جانے کے لیے اتر پردیش کے حسن پوری گاؤں سے دہلی آئے تھے۔ اس وقت شہر دہلی خود آگ میں جل رہا تھا۔ انسانی آہ و بکا اور چیخ و پکار کے بیچ دہلی کو بچانے والا کوئی نہ تھا۔ اس منظر کو دیکھ کر سبطین نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے:

> ''ایک خوفناک ہنگامہ خیز رات ہے۔ جس نے پوری دلّی کو اپنے قبضے میں لے رکھا ہے۔ رات محلّہ کے ہر شخص کو یقین تھا کہ حملہ ہوگا مگر حملہ نہیں ہوا۔ قیامت سر پر آ کر ٹلی جاتی ہے۔ یہ تذبذبت کی کیفیت سخت اذیت ناک ہے۔ قیامت کو اگر ٹوٹنا ہے تو کیوں کر نہیں ٹوٹ پڑتی ہے۔ یہ تو ایسی ہی بات ہے کہ مجرم کو پھانسی کے تختے پر کھڑا کر دیا جائے اور جلاد کہے کہ ہم حقہ پی کر آتے ہیں، پھر تجھے پھانسی پر لٹکائیں گے۔ یہ پورا محلّہ پھانسی کے تختے پر کھڑا ہے۔ پھانسی کا پھندا سر پر لٹک رہا ہے۔ گلے میں نہیں آیا۔'' (۱۵)

ناول کے خاتمہ پر بھی قاری کرب و ملال، مایوسی و افسردگی کی حالت سے گزرتا ہے۔ کیوں کہ ناول نگار نے مہاجرین کو بے مقصد زندگی گزارتے ہوئے پیش کیا ہے۔ یہی عدم توازن، بے اعتمادی، بے سمتی اور یاس 'چاند گہن' کی فضا پر مکمل طور پر حاوی نظر آتا ہے۔

انتظار حسین کے ناولوں کی عورت سماجی اعتقادات کو ساتھ لے کر چلتی ہے۔ نا مساعد حالات کے سبب وہ ضعیف الاعتقادی کا شکار بھی ہو جاتی ہے۔ انتظار حسین کے ناول 'چاند گہن' میں 'بو جی' کا کردار ایسی خواتین کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس دور کی عورتوں میں اس طرح کی قباحتیں عام تھیں۔ 'بو جی' کے کردار کے ذریعہ جنھیں بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً 'مجھے شک آوے ہے' کا فقرہ تو گویا ان کی گھٹی میں پڑا تھا۔ ہر بات میں شک، ہر کام میں شک، پتا کھڑکا اور ان کے کان کھڑے ہوئے، الٹی آنکھ کھلی اور ان کا دل دھڑکا، ہچکیاں آنا شروع ہوئیں تو انھیں یقین ہوا کہ انھیں کوئی یاد کر رہا ہے۔ اگر کہیں دانتوں تلے زبان کٹی تو فوراً گمان گزرتا کہ کوئی ان کی غیبت کر رہا ہے۔ ان خواتین کے لیے جانور بھی نیکی اور بدی کے نمائندے تھے۔ کسی سے نیک شگون لیتی تھیں، کسی کو بد فال سمجھتی تھیں اور کوئی نجاست کی پوٹ تھا۔ یہ توہمات نا مساعد حالات کے خلاف ایک ردعمل تھے، جن کا شکار یہ خواتین تھیں۔

۱۹۴۷ء کی دلّی کی ناخواندہ اور نیم خواندہ خواتین کی آپس میں 'گفتگو نہ صرف ان کی سوچ کی آئینہ دار

ہے۔ بلکہ اس دور کی متوسط طبقے کی شریف عورت کے تصور کو اجاگر کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ جس کی مثال 'چاند گہن' میں ایک مجلس میں اکٹھا ہونے والی خواتین کی آپسی گفتگو سے ہوتا ہے۔ نمبردارنی زمانے کا گلہ کرتے ہوئے کہتی ہے:

''اے نگوڑا! آج کا زمانہ ہی ایسا ہے، اب وہ اگلے زمانے کی صحبتیں کہاں۔ ارے بوجی! تم نے تو ہماری بوا کو دیکھا تھا، کیسی ملنسار طبیعت کی تھیں۔ کسی کی ایسی ویسی خبر سن لیتی تھیں تو تڑپ جاتی تھیں۔ فوراً دیکھنے کو جاتی تھیں۔ مگر آج کل کی لونڈیوں کی آنکھ میں مروت، نہ دل میں محبت، خون سفید ہو گیا، کسی کا دم چلنے لگے تو منہ میں پانی بھی نہ ڈالیں۔''(۱۶)

بوا اس بات کا جواب یوں دیتیں:

''اے چلو! رہنے بھی دو، آج کل تو بس دور ہی بھلے ہیں۔ نہ ملیں گے نہ جوتیوں میں دال بٹے گی .....ایسے ملنے پر خاک۔''(۱۷)

بوجی کو بلو کا یہ قنوطی انداز پسند نہ آیا۔ کہنے لگیں:

''اری بلو! یہ تو تیری خواہ مخواہ کی بات ہے۔ بھئی برتن جب ملیں گے تو کھنکیں گے بھی۔ ایسا کون سا گھر ہے جس میں بات نہیں نکلتی۔ چوہوں سے کان تو کٹائے نہیں ہیں کہ بات ہی نہ کریں۔''(۱۸)

جب بات آزادی تک پہنچتی ہے تو نمبردارنی اس طرح بپھرتی ہے:

''آزادی، آزادی، اس لچی، حرام زادی، آزادی کی تو ناک چوٹی کاٹ کے جوئیں مار مار کے باہر دھکے دے دیئے جائیں۔ چھنال نے آتے ہی خون خچر کرا دیے۔''(۱۹)

'خون خچر' کا لفظ سن کر تو ان کے جسم میں تھرتھری پیدا ہو گئی۔ دہشت زدہ آواز میں بولی:

''ارے بھئی، بڑی قیامت اٹھ رہی ہے۔ پنجاب میں تو نو نیزے پانی چڑھا ہے اور سنیں ہیں کہ دلّی میں بھی۔''(۲۰)

یہ تمام خواتین شرفا کے ان گھرانوں سے تعلق رکھتی ہیں جو اپنے مردوں سے یا نوکرانیوں سے اِدھر اُدھر کی سن کر اپنی محبوب معلومات سے دوسروں کو مستفیض یا ہراساں کرتی ہیں۔ پھر یہی خیالات انھیں ڈراؤنے

خوابوں کی صورت میں دکھائی دیتے ہیں جس کے نتیجے میں مزاروں پر چراغ جلائے جاتے ہیں۔ منتیں مانی جاتی ہیں۔ گھروں میں مجلسیں منعقد کی جاتی ہیں۔ جہاں خواتین اکٹھی ہوتی ہیں تو یہاں ایک مرتبہ پھر طرح طرح کی باتیں اور افواہیں گردش میں آجاتی ہیں۔ ایسی خواتین میں تعلیم اور معلومات کی کمی ہے۔ اس جہالت اور پس ماندگی کو چھپانے کے لیے دوسروں کی عیب جوئی ان کا بہترین مشغلہ ہے۔ دراصل انتظار حسین کا موضوع وہ معاشرہ ہے جسے وہ چھوڑ آئے تھے اور اس کی بازیابی ہی ان کے تخلیقی ادب کا مقصد ہے۔

فسادات کے پس منظر میں خواتین کے مجموعی سراپے کی عکاسی انتظار حسین سے بہتر کسی کے ہاں نہیں۔ گھر سے بے گھر ہوتے ہوئے بھی اس دور کی خواتین کی فکر پر ضعیف الاعتقادی کا پردہ پڑا ہے:

''اجی میں نے تو خالی مہینے میں ہی کہہ دیا تھا کہ کچھ ہو کر رہے گا۔ میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ دلّی میں دھوم کی بارات نکل رہی ہے۔ باجا، گاجا، تار، گولے، مہتابیاں، چھٹتے چھٹتے پھلواری بننے لگی۔ میں جو صبح کو اٹھی تو میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ اے بی، وہ دن ہے اور آج کا دن ہے۔ ایک دن چین کا نہ آیا اور وہ لٹس پڑی کہ دلّی کا اوجڑ ہو گیا۔''(۲۱)

بو جی اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتی ہیں:

''اری بی بی! میں نے تو جس دن دُم دار ستارہ دیکھا تھا۔ اسی دن کہہ دیا تھا کہ غدر پڑے گا۔''(۲۲)

نمبر دار نی اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتی ہے:

'''میں نے یہ کہا تھا کہ بھئی آج کل تارے بہت ٹوٹ رہے ہیں۔''(۲۳)

انتظار حسین کے ناولوں کی عورت کا مسئلہ یہ ہے کہ اس کے پاس وقت زیادہ اور کام کم ہے۔ ایسے میں اگر کوئی موضوع ان کے ہاتھ لگ جائے تو وہ اس پر بے تکان گفتگو کرتی ہے۔ ان کے جملوں اور مکالموں کی ساخت، لب ولہجہ اور محاورات سے اندازہ ہوتا ہے کہ انتظار حسین خواتین کی زبان سے بخوبی واقف ہیں۔ مثلاً مذہب کی اجازت کے باوجود ہمارے معاشرے میں بیوہ کا دوسرا بیاہ رچا لینا کبھی بھی مستحسن نہیں سمجھا گیا۔ اگر کوئی بیوہ یہ اقدام کرتی ہے تو مردوں کی نسبت خواتین کا ردعمل زیادہ شدید ہوتا ہے۔ یہ ردعمل اور خواتین کی زبان میں ہی ملاحظہ ہو:

''اری! خصم مرا تو وہ ایک دن بھی بیٹھ کر نہیں روئی اور کوئی ہوتی تو جیسے اس کا سہاگ لٹا تھا تو وہ

سر بھی نہ اٹھاتی۔''

''اجی اس نے تو خدا کا شکر ادا کیا کہ چلو اچھا ہوا، چھٹکارا ملا۔ نابی بی! اس مرد سے تو اس کا دل ہی نہ ملا۔''

''مگر وہ مرد بڑا جنتی تھا۔ اس نے اس کے ہاتھوں میں دل رکھا اور کوئی ہوتی تو ایسے میاں کے پیر دھو دھو کے پیتی۔''

''اجی وہ عورتیں اور ہووے ہیں، یہ اچھال چھکا تو میاں کو خاطر میں ہی نہ لائی۔ اس کا تو دیدہ پھٹا ہوا تھا۔'' (۲۴)

انتظار حسین کے ناولوں میں عورت کا روپ محض جلی کٹی سنانے کا ہی نہیں۔ بلکہ وہ ایسے روپ میں سامنے آتی ہے جو سادہ، اداس اور خاموش ہے۔ جس کی وجہ سے اس کا اپنے ماحول سے عدم اعتماد اور بیگانگی کا رشتہ ہے۔ 'بستی' میں افضال کی 'نانی' اور 'تذکرہ' میں 'بوجان' کا کردار ایسی ہی خواتین کی نمائندگی کرتا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ عورت کس شدت سے اپنی جنم بھومی سے محبت کرتی ہے۔ ان کے ناولوں کی سیدھی سادی عورت، اپنی زمین چھوڑنے کے بعد ہمیشہ بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا رہتی ہے۔

بستی (اشاعت: ۱۹۷۹ء):

'بستی' [۱۹۸۰ء] انتظار حسین کا بہت مشہور ناول ہے جو تقسیم پاکستان سے متعلق ہے۔ یہ ناول قیام بنگلہ دیش، ہندو پاک کے مہاجرین کے درد و کرب، ان کی نفسیاتی الجھنوں، تہذیبی شکست، آبادی میں ویرانی کا احساس اور ۱۹۷۱ء کی جنگی تباہی و بربادی کو محیط ہے۔ یہ ناول گزرے ہوئے حالات کی ایسی داستان ہے جہاں زندگی اپنی سادگی اور معصومیت کے ساتھ ایک عجیب معنویت کے ساتھ نمایاں ہوتی ہے۔ اس ناول کے اہم کردار ذاکر، سلامت، افضال، زوّار، صابرہ اور انیسہ وغیرہ ہیں۔ یہ متوسط گھرانے کے لوگ ہیں جو ہمیشہ احساس کمتری میں مبتلا رہتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کے کردار فلسفیانہ پیچ و خم کے حامل نظر آتے ہیں۔

ناول بظاہر 'روپ نگر' گاؤں میں ذاکر کے بچپن سے شروع ہوتا ہے۔ اسی طرح آسانی کے لیے ذاکر اور صابرہ کو ناول کا مرکزی کردار کہا جا سکتا ہے۔ ناول میں نہ تو مقام ہی مقام کا پابند ہے نہ ہی وقت، وقت کا۔ اسی لیے کہانی بھی ماورائے تسلسل اور تلازمات میں سفر کرتی آگے بڑھتی ہے۔ یہ بات اعتماد کے

ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ۱۹۷۱ء میں قیام بنگلہ دیش پر یہ ناول ختم ہوتا ہے۔ پیچھے کہاں تک جاتا ہے اور کیوں جاتا ہے یہ معاملہ تفصیل طلب ہے۔ اس لیے کہ اسے نہ تو تاریخی زمرے میں رکھا جاسکتا ہے اور نہ ہی تاریخ کی تشریح کا وسیلہ بنانا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ذاکر کے ساتھ صابرہ دولھا دلھن کے سوا سبھی کھیل کھیلتی ہے۔ وہ بچپن ہی میں اپنی اپنی قبریں بناتے ہیں۔ ذاکر خاندان کے ایک حصے کے ساتھ نقل مکانی کر جاتا ہے اور صابرہ یہیں مقیم رہتی ہے۔ آپ چاہیں تو اسے ناول نگار کا ذاتی قضیہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن پھر سوال ہوگا کہ غیر ذاتی کیا ہوتا ہے؟ ہوتا بھی ہے یا نہیں؟ ناول میں حال، حال کے ساتھ ماضی بھی ہے۔ اس حوالے سے اردو شاید بہت سی زبانوں سے مختلف اور متنوع ہے۔ اس کا کل ماضی بھی ہے اور مستقبل بھی۔ لیکن ناول یہاں تک نہیں جاتا۔ اس میں حال ماضی ہے اور ماضی حال۔ ناول وہاں ختم ہوتا ہے جہاں کل مستقبل کے سامنے کھڑا ہے۔

تقسیم کے وقت ذاکر اور اس کے والدین ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان کی مقدس سرزمین پر مہاجر کی حیثیت سے آئے اور یہیں بس گئے۔ لیکن ماضی کی یادیں اور اپنے وطن کی مٹی کو کبھی بھلا نہ سکے۔ انھیں نیم کا پیڑ، ساون کے جھولے، آم کے باغات، بلبل کی صدا، متروکہ حویلیاں، ویران مندر، بوسیدہ مدرسے، دھول بھری پگڈنڈیاں برابر پریشان کیے جارہی تھیں۔ ناسٹلجیا کی اس کیفیت کی تصویر کشی مصنف نے یوں کی ہے:

> ''نیم کا پیڑ بھی میں نے دریافت کر ہی لیا مگر کوئل کی آواز پہلے سنی۔ اس دیار میں وہ میرا پہلے پہل کوئل کی آواز سننا.....کوئل کی آواز امی نے سنی تو بری طرح چونکیں۔ آئے ہائے! کوئل بول رہی ہے۔ پھر میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھیں بھیگنے لگی ہیں۔ کوئل کی آواز میرے لیے محکمۂ بحالیات کا پروانہ بن گئی کہ اس کے بعد میں اس شہر میں رستا بستا چلا گیا۔ مگر امی کے یہاں اس آواز نے مختلف اثر کیا۔ سوئی ہوئی یادوں کو جگا دیا۔'' (۲۵)

پچیس سال بعد ذاکر کی ماں کو وہ ساری خاندانی نشانیاں، کربلا سے آیا ہوا کفن، مدینہ منورہ سے آنے والی جاے نماز، جہیز کے لیے رکھے ہوئے سارے سامان کو دھوپ دکھانے کی فکر، یہ ساری ماضی کی یادیں، ایک کوئل کی آواز سے دل و دماغ میں تروتازہ ہوجاتی ہیں۔ ناول نگار نے اس اقتباس سے یہ بھی

واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہجرت کرنے والے چاہے کہیں بھی جا کر شان وشوکت اور عیش وعشرت کی زندگی گذاریں مگر اپنے نئے وطن اور اس کی تبدیل شدہ حقیقتوں سے مفاہمت نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ پرانی یادوں اور قدیم علامتوں کے بغیر ان کی شخصیت کی تکمیل ہو ہی نہیں سکتی۔

انتظار حسین کے یہاں ہجرت ایک اجتماعی سانحہ ہے۔ کھوئے ہوئے تذکروں کی تلاش، جدّی نشانیوں اور کربلا کی سرزمین سے لائے ہوئے کفن کو پچیس سال کے بعد دھوپ دکھانے کی خواہش، کوئل کی صدا، نیم کے پیڑ کو ڈھونڈنا وغیرہ یہ سب کے سب یوپی کے اس قدیم کلچر کی علامتیں ہیں جو تقسیم سے پہلے کی قصباتی زندگی کا ایک حصہ اور اجتماعی شعور کا ایک جز تھیں۔ انتظار حسین نے زیادہ تر یوپی کے مسلم مہاجرین کی ہجرت کو ہی اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔ تقسیم سے پہلے کی زہر آلود فضا، ہندو مسلم منافرت، ترک وطن کا مسئلہ، جائداد و املاک کی فروخت، قبرستانوں اور کچے مکانوں کا تحفظ، مشترکہ تہذیبی رشتہ، عوام میں سیاسی بیداری اور انگریزوں کے ظلم وستم کے خلاف طالب علموں کا سیاسی رویہ وغیرہ کو بڑے ہی فن کارانہ انداز میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔

ان کے ناول 'بستی' میں افضال کی نانی بھی کم و بیش اسی کیفیت میں مبتلا رہتی ہے۔ وہ جب ہندوستان سے چلے تھے تو برسات کا موسم تھا اور باڑھ آئی ہوئی تھی۔ ادھر فسادات، ادھر باڑھ، مگر نانی زمین نہیں چھوڑتی تھی۔ افضال کی ماں نے اسے سمجھایا تھا کہ اماں ہم تو باڑھ کی وجہ سے جا رہے ہیں۔ جب اترے گی تو واپس آ جائیں گے۔ بھولی بھالی نانی چکر میں آ گئی۔ مگر وہ بات اس کے دماغ میں پھنسی رہی۔ تھوڑے تھوڑے دنوں بعد واپسی کا تقاضا کرتی رہی:

> ''کا کی! باڑھ اتر گئی ہوگی، مینوں واپس لے چل۔'' (۲۶)
>
> ''ایک دن بہت لجاجت سے اس نے مجھ سے کہا کہ کا کا! اتنا ویلا ہو گیا، اب تو باڑھ اتر گئی ہوگی، مجھے تو گھر لے چل۔ میں نے کہا کہ میری نانی! باڑھ اتر گئی مگر اب اس طرف چڑھ گئی ہے۔ اس نے مجھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا۔ بس ایک لفظ کہا: 'اچھا' اور مر گئی۔'' (۲۷)

عورت کے یہ احساسات 'تذکرہ' میں بھی سامنے آتے ہیں جو اپنے گھر اور تہذیب کو گلے سے لگائے اس دنیا سے رخصت ہو جاتی ہیں۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ عورت کی زندگی میں اس کے گھر کی کیا قدر و

قیمت ہے۔ یہ گھر نسلوں کے امین ہوتے ہیں اور کوئی 'چراغ حویلی'، 'آشیانہ' میں تبدیل نہیں ہوسکتی۔ 'تذکرہ' کی بوجان کے روپ میں جوعورت 'چراغ حویلی' میں جیتی تھی، وہ پاکستان آ کر کرائے کے گھروں میں رہ کر کتنے روز اندہ رہ سکتی تھی؟ بوجان اور ان کی بہوزبیدہ عورت کے حوالے سے دومختلف نسلوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ بوجان جو 'چراغ حویلی' کے وسیع وعریض باورچی خانے میں مٹی کی ہنڈیا میں لکڑی کی دھیمی آنچ پر کھانا تیار کرتی تھیں۔ اب 'آشیانہ' کے کچن میں بہوکو گیس کے چولہے پر ککر میں کھانا تیار کرتے ہوئے دیکھتی ہیں تو وہ دوبارہ کچن کا رُخ نہیں کرتیں۔

انتظار حسین کے ناولوں کی بزرگ خواتین جو پرانی روایات کی حامل ہیں اور جنھیں زندگی کے آخری دور میں اپنے گھروں سے بے گھر ہونا پڑا۔ جن گھروں میں ان کی ڈولیاں آئی تھیں۔ ان کی تمنا تھی کہ انہی ڈیوڑھیوں سے ان کے جنازے نکلیں۔ نئے ملک اور نئے ماحول میں جب زیادہ دنوں تک وہ سانس نہ لے سکیں اور ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئیں۔ ان خواتین کے رخصت ہوجانے پر گھروں میں خاموشی نے ڈیرے ڈال دیے۔ بہت عرصے تک ان کی آواز کی بازگشت، اے دلہن! اے بیٹے! اے لال! کی صورت میں گونجتی رہی۔ ان کے سینے میں اگلے پچھلے کتنے ہی حصے اور کتنی ہی کہانیاں بسی ہوتی ہیں اور ان کے جانے سے وہ تمام زمانے روپوش ہوجاتے ہیں۔ یہ خواتین اپنی ذات میں زمانوں کا سنگم تھیں کہ کتنے زمانے کہاں کہاں سے آ کر یہاں ملتے تھے اور خوش اسلوبی سے جدا ہوجاتے تھے۔

جب کہ آج کی عورت انتظار حسین کے ہاں زبیدہ [تذکرہ] کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے جو سمجھتی ہے کہ شوہر، مکان اور بنک بیلنس یہ تین چیزیں اسے تحفظ فراہم کرتی ہیں۔ آج کی عورت چاہتی ہے، شوہر اس کا مطیع ہو، بنک بیلنس بڑھتا جائے اور مکان ذرا سا پرانا ہونے پر بیچ کر نئے پوش علاقے میں بنایا جائے۔

مجموعی طور پر انتظار حسین کے ناولوں کے موضوعات فسادات، ٹوٹتی روایتیں اور اقدار و رواداری، خدشات، توہمات وغیرہ ہیں۔ رومانس ان کے ناولوں کا موضوع نہیں، اس لیے ان کے ناولوں کی عورت سج سج دھج کر سامنے نہیں آتی۔ ان کے ناولوں میں عورت کی حیثیت نفسیاتی استعاروں کی سی ہے، جسے اگر ناول سے نکال بھی دیا جائے تو ناول کی حیثیت میں کسی طرح کا کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اس کا اظہار خود انتظار

حسین یوں کرتے ہیں:

''میرے ایک محترم دوست شیخ صلاح الدین نے بہت بے زار ہو کر کہا کہ 'تمھارے افسانوں میں عورت نظر نہیں آتی۔' 'عورت؟' شیخ صاحب، اتنی تو عورتیں ہیں میرے افسانوں میں.... عورتیں نہیں، عورت، عورت، کہاں ہے، تیرے افسانوں میں۔ اس اعتراض نے مجھے تھوڑا گڑبڑایا۔ میں نے اپنی یادوں کو کریدا، دھندلا دھندلا خیال آیا کہ اپنی برادری میں ایک دو عورتوں نے عورت بننے کی ہمت کی تھی مگر یا تو وہ درمیان میں پچک گئیں یا اس برادری نے، جہاں بچیاں اور بوڑھیاں بھی پردہ کرتی تھیں۔ ان کے لچھنوں پر پردہ ڈال دیا یا پھر اس معاملے میں اپنا مشاہدہ کمزور تھا۔''(۲۸)

انتظار حسین کے ناولوں کے حوالے سے بھی یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ان کے یہاں عورتیں تو ہیں مگر عورت کے معاملے میں ان کا مشاہدہ کمزور ہے۔ انتظار حسین کی نثر پڑھتے ہوئے ایسا لگتا تھا کہ ہم روایت اور تہذیب کے نمائندے سے بات کر رہے ہیں۔ وہ ایسی تہذیب کے باسی ہیں جس کا تذکرہ صرف اب کتابوں میں ملتا ہے۔ ان کے یہاں داستان گوئی انداز ملتا ہے۔

عبدالصمد: دوگز زمین

آزادی کے بعد ابھرنے والے ناول نگاروں میں عبدالصمد اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں۔ انھوں نے کئی ناول لکھے ہیں۔ ان میں 'دوگز زمین' تقسیم ہند اور ہجرت سے متعلق ہے۔ اس ناول میں تحریک خلافت سے قیام بنگلہ دیش تک کے تمام سیاسی و معاشرتی اور انسانی تہذیب کی شکست و ریخت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ۱۹۸۸ء میں اس ناول پر ساہتیہ اکادمی انعام بھی تفویض کیا گیا۔

'دوگز زمین' [اشاعت: ۱۹۸۸ء] بہار کے ایک گاؤں 'بین' کے پس منظر میں خلافت تحریک سے قیام بنگلہ دیش تک کے سیاسی تغیرات کے پہلو بہ پہلو رونما ہونے والی انسانی تبدیلیوں کی عکاسی کرتا ہے۔ ہجرت اور غریب الوطنی کے مسائل سے جب ناول نگار کا شعور متاثر ہوا اور نقل مکانی اور جغرافیائی و تہذیبی تبدیلی نے فکر و احساس میں تلاطم پیدا کیا تو اردو ناول پر بھی اس واردات کے نقوش ثبت ہوئے۔ اس پس منظر میں اگر ہم دیکھیں تو مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کے مہاجرین کے تجربات میں واضح فرق نظر آئے گا۔ تقسیم نے مغربی پاکستان جا کر آباد ہونے والوں کو جو زخم دیے تھے، وہ رفتہ رفتہ مندمل ہوتے گئے۔ لیکن مشرقی پاکستان میں اردو بولنے والے مہاجر ابھی اپنی دھرتی کے لمس اور دیرینہ روایت سے بچھڑ جانے کے احساس سے نکل بھی نہ پائے تھے کہ انھیں اپنے نئے وطن سے اکھاڑ پھینکا گیا۔ وہ خستہ دل اپنے پرکھوں کے گھر لوٹے تو یہاں بھی سیاسی، لسانی اور تہذیبی منظر بدل چکا تھا۔ نئے ماحول میں ان کے اپنے بھی انھیں گلے لگانے سے گھبرا رہے تھے۔

عہد اور ماحول سے اخذ کردہ نتائج کو فن کار اپنے زاویۂ نگاہ سے دیکھتا اور اپنی تحریروں میں پیش کرتا ہے۔ پیش کش کا انداز جتنا پر اثر ہوتا ہے، ناول اتنا ہی کامیاب قرار پاتا ہے۔ دوگز زمین کا موضوع خلافت

تحریک، کانگریس اور مسلم لیگ کے فرقہ وارانہ نظریے، نوجوانوں اور بنگالیوں کی روشن خیالی، پاکستان اور یوپی مہاجرین کی بنگلہ دیشیوں سے نفرت، ہندوستان میں محکمہ کسٹوڈین کی زور زبردستی اور غریب زمین داروں کی جنونی کیفیت، وجود بنگلہ دیش اور پاکستانی افواج کی شکست کا احاطہ کرتا ہے۔ بقول صغیر افراہیم:

> ''دوگز زمین بہاری مسلمانوں کی جہد انگیز روداد ہونے کے باوجود تمام مہاجرین کی کہانی بن گئی ہے۔ یہ ناول قومی یکجہتی اور حب الوطنی کے جذبے سے معمور خلافت تحریک سے شروع ہوتا ہے اور تمام سیاسی، سماجی، ثقافتی، معاشی اور لسانی خلفشار اور تعصّبات کا پردہ چاک کرتے ہوئے قیام بنگلہ دیش پر ختم ہوتا ہے۔''(۲۹)

بہار شریف کے مسلمان جو عام طور پر گاندھی اور نہرو کے سیکولر کردار اور کانگریس کی رواداری کے حامی تھے۔ اس میں تبدیلی اس وقت رونما ہوئی جب نہرو رپورٹ آنے کے بعد مسلم لیگ نے یکا یک کانگریس کے ہندو پرستانہ مزاج کی مخالفت میں ایک خالص اسلامی سیاسی پارٹی کا چولا اختیار کرلیا اور آزادی کے خواہاں مسلمان دو حصوں میں منقسم ہو گئے۔ سارے ملک میں فرقہ وارانہ ماحول بن گیا اور مسلم لیگ مضبوط تر ہوتی گئی۔ کانگریسی مسلمانوں کی حالت اب عجیب ہوگئی تھی کیوں کہ لیگ کے پروپیگنڈے کے زیر اثر مسلمان ان کو ہندو نواز سمجھتے تھے۔ اس لیے کہ کانگریس کے بیش تر رہنما واضح مذہبی جھکاؤ رکھتے تھے۔

بہار شریف سے پندرہ میل کی مسافت پر 'بین' گاؤں کے زمین دار الطاف حسین خلافت تحریک کے سرگرم کارکن ہیں۔ ان کی زندگی کے چالیس برس یوں ہی گزر جاتے ہیں۔ تحریک کی خدمت کرتے ہوئے ان کے چار بیٹے [جن میں سرور حسین اور صغیر حسین خاص ہیں] اور چار بیٹیاں ہیں۔ شیخ الطاف کے بڑے داماد اختر حسین ان کے بعد نامساعد حالات میں بھی کانگریس کے سیکولرازم اور بھائی چارے کا علَم بلند رکھتے ہیں اور لیگ کی انتشار پسند سیاست کو علاقے میں پھلنے پھولنے کا موقع نہیں دیتے۔ لیکن ۱۹۴۶ء کے انتخاب میں ملک کی فضا اس قدر مسموم ہوگئی کہ بنگال اور پنجاب کے شہروں میں ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے۔ دونوں فرقوں نے تشدد اور بربریت کا مظاہرہ کیا۔ گاندھی جی اور نہرو کی کوشش نے شہر میں ہونے والے فساد ات کو روک لیا۔ لیکن گاؤں میں فسادات پر قابو نہیں پایا جاسکا تھا۔ کیوں کہ خود کچھ کانگریسی لیڈران بھی فرقہ پرستی کو ہوا دے رہے تھے۔ اختر حسین کے علاقے میں بھی فسادات ہوئے۔ اس موقع پر تعداد میں کم ہونے

کے باوجود ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کی حفاظت کا بیڑہ اٹھایا۔اس کے باوجود فرقہ پرست عناصر اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔مسلم لیگ کی جذباتی اپیل قوم کے احساسِ عدم تحفظ میں اضافہ کا سبب بنی اور تقسیم کے زمانے میں برصغیر کی سب سے بڑی ہجرت کا خونی منظر ملک وقوم کو دیکھنا پڑا:

''کانگریس اور مسلم لیگ کی بنیادوں پر گھر گھر تقسیم ہو گئے۔ ہندو اور مسلمان کا امتیاز لوگوں کے درمیان جگہ جگہ ان دیکھا ہوّا کھڑا کرتا پھر رہا تھا۔پنجاب اور بنگال کے بہت سے علاقوں میں کئی ہندو مسلم فسادات ہو چکے تھے۔جن کا یہاں خوب خوب ذکر ہوا تھا۔'مسلم لیگ' والے تو پاکستان کا خواب دیکھ کر جا چکے تھے۔ان کے جانے کے بعد 'ہندو مہا سبھا' نے ان کے اس خواب کی ایک بھیانک تعبیر کو ہر ہندو گھر میں پہنچانے کا ذمہ لیا تھا۔''(۳۰)

اپنی زمین اور وطن سے بے پناہ محبت کرنے کے باوجود واقعات وحالات کے زیر اثر انسان کو اکثر سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے۔'دو گز زمین' میں بھی یہی صورتِ حال ہے:

''اماں! ہم لوگوں کے پاس اتنے کھیت ہیں۔باغات ہیں۔لیکن دیکھنے والا کوئی نہیں۔کیا کریں بیٹا! تم لوگ پردیس چلے گئے۔وسیم اور شمیم گھر پر رہتے نہیں۔بڑے دولہا سب دیکھتے تھے۔سو اب فرصت ہی نہیں ملتی۔

غلہ، پھل وغیرہ آجاتے ہیں؟

اماں میری مانیے تو ایک کام کیجیے۔جو کھیت پھیلے ہوئے ہیں، انھیں بیچ دیجیے اور پیسے بینک میں رکھوا دیجیے۔اس سے بہنوں کی شادیاں ہو جائیں گی اور کھیتی کرنے میں آسانی ہوگی۔

بیٹا! زمین بیچنا شریفوں کا شیوہ نہیں اور پھر یہ سب زمینیں تو خاندانی ہیں۔

اماں! زمانہ بہت بدل چکا ہے۔ہر چیز بدل رہی ہے۔زمینداری نہیں رہی، وہ بات ہی نہیں رہی۔''(۳۱)

نئی نسل اپنی مالی ضروریات کی تکمیل کے لیے آبائی زمین کو فروخت کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتی۔ مگر ماں جو پرانی روایات واقدار کی علامت ہے۔اس زمین سے اس کا جذباتی انسلاک ہے۔وہ اس وراثت کو کھونا نہیں چاہتی۔اس لیے کہ یہی جڑیں تو اسے روحانی 'آب ودانہ' مہیا کرتی ہیں۔اسی لیے وہ اس زمین سے اپنا تعلق استوار رکھنا چاہتی ہے۔اس کے باوجود اس کے بیٹے اس احساس کو سمجھ نہیں پاتے اور

اسے فروخت کرنے پر اصرار کرتے ہیں۔ ماں ممتا کا مظاہرہ کرتے ہوئے خون کے گھونٹ پی کر اس کے لیے راضی ہو جاتی ہے۔ تخلیق کار نے یہاں یہ بات ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسان فطری بنیادوں پر ضرب لگا کر اپنی زندگی کو خوش گوار بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی بہترین مثال ماں کا کردار ہے۔ جدید انسان اسی طرح کی صورت حال سے ہمیشہ دوچار رہتا ہے:

''..... پہلے لوگ پاکستان سے بھاگتے تھے۔ اب دیہاتوں سے بھاگ کر شہر آتے ہیں۔ خطرناک بات یہ ہے کہ اب آبادیاں فرقہ وارانہ بنیادوں پر استوار ہونے لگی ہیں۔ ہندوؤں کے محلے میں مسلمان رہنا پسند نہیں کرتے اور مسلمانوں کے محلے میں ہندو رہنا نہیں چاہتے۔ مسلمان ہندوؤں کے محلے سے بھاگ رہے ہیں اور ہندو مسلمان کے محلے سے۔ اب ذرا سوچو [تم سے ہندوستان کا اتنا رشتہ تو ہے یہی کہ اس بارے میں سوچ سکو] کہ اگر یہی صورتِ حال رہی تو ملک کتنے ٹکڑوں میں بٹے گا۔ آج تو ہم ایک ہی تقسیم کو لے کر رو رہے ہیں لیکن یہاں تو ان گنت تقسیم کے بیج بوئے جا رہے ہیں۔''(۳۲)

۱۹۴۷ء کے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے تقسیم اور ہجرت کی زائیدہ نفسیات اور مسائل کو اجاگر کیا گیا ہے۔ مذہب کی حفاظت کے نام پر اور دوسروں کے ردعمل میں ہجرت کرنا اور بسنا لوگوں کا مقصد حیات بن گیا ہے۔ جو سخت تکلیف دینے والا ردعمل ہے:

''عزت نفس یہاں نہیں ہے ابا! جس چیز کے لیے ہم لوگ ہندوستان میں مرتے رہے۔ پاکستان میں ترستے رہے، اس نشے کا یہاں وجود ہی نہیں ہے۔ یہاں سب کچھ کھو کر جو چیز حاصل ہوتی ہے، وہ پیسہ ہے۔ جس سے ہر چیز بازار میں خریدی جا سکتی ہے۔ بس تین چار برس یہاں اور رہنے کا ارادہ ہے۔ اس سے زیادہ ہمت نہیں ہے۔ ان تین چار برسوں کے بعد جو کچھ ہاتھ لگے گا، اسی کے سہارے ساری زندگی بسر کرنے کا ارادہ ہے۔''(۳۳)

انسان پیسے کی ہوڑ میں اپنی زمین اور اپنی وراثت سے ہجرت کرتا ہے۔ اپنے آسایش کے لیے مال کی خواہش اس پر اس قدر حاوی ہوگئی ہے کہ اس کے لیے عزت نفس کوئی معنی نہیں رکھتی۔ تصنع اور نمایش کی معاشرے پر حکمرانی ہے۔ زر پرستی نے لوگوں کے اطمینان وسکون کو پوری طرح غارت کر دیا ہے۔

ناول نگار نے قیام پاکستان کو موضوع بنایا ہے کہ قیام پاکستان سے بہار کی زمین تو نہیں بٹی۔ مگر سب

سے بڑا نقصان بہار کے مسلمانوں کو ہوا۔ فسادات اور ہجرت نے بہار کے متوسط طبقے کو ہجرت پر اکسایا۔ کچھ تو خوف و دہشت اور کچھ اسلامی ریاست کے خوابناک اور درخشاں مستقبل کے فریب میں منتقل ہوئے۔ اعلیٰ طبقہ تو خیر بٹوارے کے جوش و خروش میں ہی تھا۔ مگر جب نئی زمین پر ناگفتہ بہ صورت حال کا سامنا ہوا تو سقوط ڈھاکہ کے بعد بہت سے لوگ ہندوستان واپس آ گئے اور روپوشی کی زندگی اختیار کی۔ اس طرح کی آمد سے کنبے کے افراد میں ان سے اجنبیت اور غیریت کی نفسیات پیدا ہونے لگیں۔ سماجی تانے بانے بکھرنے لگے۔ رشتوں میں دراڑیں پڑنے لگیں۔ متصادم صورت حال تھی۔ مزید یہ کہ حکومت نے بھی غیر ہمدردانہ رویہ اختیار کیا۔ کسی کے نام اگر پاکستان سے خط آتا تو اس پر خفیہ پولیس کی نگرانی بٹھادی جاتی۔ پناہ دینے والے ہمدرد، دہشت زدہ ہوجاتے۔ اس ناگہانی واپسی سے بہار بھی متاثر تھا۔ اس پس منظر میں 'دو گز زمین' منظر عام پر آیا۔

یہ پورا ناول سیاسی انتشار کے اردو گرد گھومتا نظر آتا ہے لیکن سماجی، اخلاقی، ذہنی اور ثقافتی انتشار کی بھی کچھ نہ کچھ عکاسی ملتی ہے۔ ناول نگار نے شیخ الطاف حسین اور ان کے داماد اختر حسین کے ذریعہ ناول کو تراشنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ یہ تمام کردار ملک کی آزادی کے لیے اپنی تمام لیاقت اور صلاحیت کو داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ گاندھی اور نہرو کے سیکولر کردار اور کانگریس کی رواداری کے حامی بھی ہیں۔ نہرو رپورٹ آنے کے بعد جب مسلمانان ہند مسلم لیگ کی طرف جھکنے لگے اور کانگریسی مسلمانوں کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی تو ایسے نازک حالات میں بھی یہ لوگ کانگریس کے علم بردار بنے رہے۔

نہرو رپورٹ کے ردعمل میں مسلم لیگ مسلمانوں میں مضبوط ہوتی چلی گئی اور ہندوؤں میں ہندو مہا سبھا ابھر کر سامنے آئی۔ ان لوگوں کے اپنے الگ الگ نظریے تھے۔ لہٰذا دو قومی نظریے کی بنیاد پر ملک تقسیم ہو گیا۔ تقسیم کے بعد جب فضا کافی خراب ہوگئی تو پنجاب و بنگال کے اکثر شہروں میں فسادات بھڑک اٹھے اور قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوگیا۔ مسلم لیگ کی جذباتی اپیل اور کانگریس کی دوہری پالیسی نے قوم و ملک کو خوں ریزی سے گزرنے پر مجبور کیا۔ زمین داری کے خاتمے کا اعلان ہو چکا تھا۔ اس خاتمے سے اختر حسین اور ان کا گھرانہ تباہی اور بربادی کی دہلیز پر پہنچ گیا۔ کچھ لوگ پاکستان ہجرت کر گئے لیکن اختر حسین سیکولرزم اور انسان دوستی کے جذبے سے سرشار نہرو اور آزاد کے شانہ بشانہ ہندوستانی عوام کی ترقی کے خواہاں رہے۔

اختر حسین کا ایک بیٹا حامد ملازمت نہ ملنے کی وجہ سے غیر قانونی طریقے سے مشرقی پاکستان چلا گیا جہاں اس نے ایک بنگالی دوشیزہ سے شادی کر لی۔ وہاں کی آب وہوا اسے راس نہ آئی اور تمام نشیب وفراز کو جھیلتے ہوئے بالآخر اپنے وطن واپس آ گیا۔ لیکن یہاں دوسرے لوگوں نے اس کی جائداد پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس طرح نہ جانے کتنے ہی لوگ اپنے ملک میں نہ صرف مہاجر کہلائے جانے لگے بلکہ غیر ملکی شہریوں کی طرح ہو گئے۔

اختر حسین کے گھرانے کی بزرگ شخصیت بی بی صاحبہ نے اپنی مختصر سی زندگی میں خاندان کو ہر طرف کے حالات سے گذرتے دیکھا تھا۔ کبھی بٹتے، کبھی برباد ہوتے تو کبھی آباد ہوتے بھی۔ ان تینوں ادوار کی وہ چشم دید گواہ تھیں۔ ایک بیٹا کراچی میں ہوس پرستی میں اور دوسرا نا آسودگی کی حالت میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ حامد راتوں رات فرار ہو کر مشرقی پاکستان میں جا بسا تھا۔ وہ ہندوستان کی تقسیم کے خلاف تھیں۔ کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ پورے خاندان اور معاشرے کا شیرازہ بکھر جائے گا اور وہی ہوا۔ پاکستان کے وجود نے سب کچھ تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ یہی ایک گھر متاثر نہ ہوا بلکہ اس طرح کے لاکھوں خاندان بٹ گئے۔ تباہ و برباد ہو گئے۔ بے شمار انسانی جانیں تلف ہوئیں۔ اس تقسیم سے اتنی الجھنیں اور مسائل پیدا ہو گئے جو آج تک حل نہ ہو سکے۔ ان حالات کی سنگینی کا اندازہ عبدالصمد کے اس اقتباس سے ہوتا ہے:

> ''پاکستان....ارے او نامراد! تو میرے بچے کو کھا گیا۔ میرے خاندان کو برباد کر دیا۔ اب میری بچی کو تو نہ کھا۔ خدا کے لیے یہاں سے واپس چلا جا۔ تجھ پر خدا کی مار.....میں تیرے..... ہاتھ جوڑتی ہوں۔ پاکستان اب تو میرا پیچھا چھوڑ دے۔ میں نے تیرا کچھ نہ بگاڑا۔ آخر تو مجھے کونسے گناہوں کی سزا دے رہا ہے۔ پاکستان.....ارے پاکستان.....'' (۳۴)

انسان بنیادی طور پر آرام وسکون اور خوش حال زندگی کا طلب گار رہتا ہے چاہے وہ دنیا کے کسی خطہ میں سکونت پذیر ہو۔ ملک کتنا ہی خود مختار رہا اگر سکون اسے حاصل نہ ہو تو وہ جگہ اس کے لیے وبال جان بن جاتی ہے۔ جب ہندوستان کا بٹوارہ ہوا تو مغربی پاکستان منتقل ہونے کے والے مہاجرین کو وہاں عوامی ہمدردی کے ساتھ سرکاری ملازمتیں بھی ملیں اور ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی جائدادیں بھی ان کی ملکیت ہو گئیں۔ لیکن مشرقی پاکستان میں ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ وہاں نہ تو عوام کی طرف سے کسی طرح کی مدد ملی اور نہ

ہی سرکاری مراعات اور ملازمتیں حاصل ہوئیں۔جس کی وجہ سے عوام میں بے چینی کی کیفیت برقرار رہی۔ مشرقی پاکستان کے بنگالیوں کی لبرل ثقافت کے زیر اثر رقص وگانے کی تربیت اور ساتھ ہی ساتھ صوم وصلوٰۃ کی پابندی کا عام رواج تھا۔اس تہذیبی انتشار اور ثقافتی تعصب کی وجہ سے مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان ہمیشہ خلیج قائم رہی۔یوپی و بہار سے ہجرت کرنے والوں اور مقامی بنگالیوں کے درمیان علاقائی و لسانی تعصب کی ہوا نے بھی اس خلیج کو اور بڑھا دیا۔آخر کار اس علاقائی تعصب وثقافتی انتشار نے پاکستان کو بھی دوٹکڑوں میں تقسیم کر دیا اور بنگلہ دیش کا قیام عمل میں آیا۔جو لوگ مغربی بنگال، یوپی و بہار سے ہجرت کر کے مشرقی پاکستان گئے۔انھیں 'بہاری' کے نام سے یاد کیا گیا اور تمام طرح کی پریشانیاں اور حادثات سے انھیں گزرنا پڑا۔قیام بنگلہ دیش کے موقع پر ان ہی بہاریوں کو دوبارہ رَوندا گیا اور ہر طرح کے ظلم وستم کے پہاڑ توڑے گئے۔دوبارہ قتل و غارت گری اور ہجرت کے کرب سے گذرنے کے بعد اب ان لوگوں کے پاس عزت، دولت اور روایت کے نام پر کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا۔نہ اب یہ بدنصیب کسی ملک کے شہری تھے۔ یہ لوگ بھی پوری کائنات کو امن وشانتی کا پیغام دینے والے مذہب اسلام کے ہی ماننے والے اور ایک ہی ملک کے شہری تھے۔پھر بھی اتنی انسانیت سوز حرکات پر اتر آئے۔گویا یہ لوگ انسانی شکل میں درندے بن چکے تھے۔ان کے اندر محض علاقائی اور نسلی تعصب کی بنیاد پر خوف خدا، خوف آخرت، انسانیت اور رحم کا فقدان تھا۔عبدالصمد نے غیر جانب داری سے کام لیتے ہوئے ان حالات کو یوں بیان کیا ہے:

> ''حامد میاں سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔کچھ بھی باقی نہیں باقی نہیں رہا۔میرے بیٹے کو ان لوگوں نے مار ڈالا۔مکان و پریس میں آگ لگا دی۔سب کچھ لوٹ لیا۔تمھاری ممانی تو صدمہ سے مر گئیں۔میں زندہ درگور ہوں۔ہائے نہ جانے کب تک مجھے زندہ رہنے کی سزا ملتی رہے گی۔میں تو روز ان لوگوں کے پاؤں پڑتا ہوں کہ مجھے گولی مار دو۔لیکن یہ کم بخت مارتے ہی نہیں۔
> یہ لوگوں کو کہاں لے جاتے ہیں....
> ارے ان لوگوں نے سبھی بہاریوں کو اسی طرح قتل کیا ہے۔جانوروں کی طرح رکھا ہے۔قصابوں کی طرح روز آتے ہیں اور چن چن کر لے جاتے ہیں گولی مارنے۔''(۳۵)

تقسیم ہند سے ہزاروں سال قبل قدیم مشترکہ تہذیب وقومی یکجہتی تو ختم ہو گئی۔ساتھ ہی آپسی بھائی چارے اور انسان دوستی کا وہ پاک جذبہ جسے پروان چڑھانے میں کبیر، نانک اور چشتی نے اپنی پوری عمر کھپا

دی تھی۔ گوتم بدھ نے عرفان اور نروان کی خاطر سالہا سال اس سرزمین پر قربان کیے۔ جہاں امن وشانتی کے پیغام کبھی اشوک، کبھی اکبر کے روپ میں چاروں طرف سنے جاتے رہے۔ جہاں مہاتما گاندھی نے مسجد کے منبر سے اور مولانا محمد علی جوہر و مولانا حسرت موہانی نے مندروں کے چبوتروں سے قومی یکجہتی اور انسانیت کا پاٹھ پڑھایا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس طرح کے ہزاروں سال کی تمام کوششیں تقسیم کی تیز و تند آندھی کی نذر ہو گئیں۔ دونوں قومیں ہندو اور مسلمان تباہی کی اس دہلیز پر جا پہنچیں، جس کی بھرپائی آج تک ممکن نہ ہو سکی۔ جنگ آزادی کے سورماؤں نے آزاد ہندوستان کے لیے جو سنہرا خواب دیکھا تھا، وہ شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

اس ناول میں عبدالصمد نے بڑے ہی منصفانہ طریقے سے انسانی تہذیب کی شکست و ریخت کا ایسا نقشہ کھینچا ہے جیسے قاری خود ہی ان حالات و حادثات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہو۔ ان ہی خوبیوں کی بنا پر عبدالصمد کا یہ انعام یافتہ ناول 'دوگز زمین' تقسیم ہند کے موضوع پر ایک شاہ کار ناول قرار پایا ہے۔

عبدالصمد نے زندگی کے حقائق کی غیر مشروط جستجو اور شناخت پر توجہ مرکوز کی ہے۔ انھوں نے نئی نسل کی سوچ اور مجبوری کو سیاسی اور سماجی نظام سے ہم آہنگ کر کے اسے تخلیقی جہت عطا کی اور عصر حاضر میں زندگی کے تیزی سے بدلتے ہوئے نظام کو سمجھنے اور اس کو فنی شعور کے ساتھ قاری تک پہنچنے کا اہتمام کیا ہے۔

بہادر شاہ ظفر تو بدنصیب تھا کہ اسے کوئے یار میں دوگز زمین میسر نہیں آئی، لیکن عبدالصمد کو دوگز زمین کا صلہ ملا۔ پذیرائی اور درازیِ عمر کی دعائیں دی گئیں کہ وہ اپنے نوک قلم سے سماج میں انقلاب لا سکیں۔ فرقہ پرستی، تعصب اور تنگ نظری کے بخیے ادھیڑ سکیں۔ ملک کی تقسیم کی ذمہ داری نہ ہندوؤں کی ہے اور نہ مسلمانوں کی۔ یہ کام تو انگریز نے کیا۔ اس نے ہندو، مسلمان دونوں کو اپنا آلۂ کار بنایا، جس کو جانا تھا وہ جا چکے، جو لوگ رہ گئے ہیں، وہ بھارت کے شہری ہیں۔ انھیں یہیں رہنا ہے، ہمارے ساتھ جینا اور مرنا ہے۔ اگر کوئی انھیں غدار اور غیر ملکی سمجھتا ہے تو وہ ملک کا دشمن ہے۔ فرقہ وارانہ بنیاد پر اس داخلی تقسیم کے ساتھ ذہنوں کو بھی عبدالصمد نے مذکورہ ناول میں بڑی مہارت سے پیش کیا ہے۔ تہذیبی اور لسانی ٹکراؤ بھی اس ناول کا بنیادی محور ہے۔ قمر رئیس نے درست کہا ہے:

''اس دہے میں برصغیر ہندو پاک میں جو چند ناول لکھے گئے ہیں۔ ان میں 'دوگز زمین' اپنے

نہایت سلجھے ہوئے Treatment اور بڑی حقیقت نگاری کی وجہ سے نمایاں رہے گا۔اس کے کردار میرے وجود کا حصہ بن چکے ہیں۔ یہ صرف ایک نہیں، ہندوستان کے لاکھوں مسلمان خاندانوں کی المناک داستان ہے۔''

بلاشبہ ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کو بیسویں صدی میں جن مراحل سے گزرنا پڑا، اس کی نہایت موثر عکاسی 'دوگز زمین' میں ہوئی ہے۔ بقول نگینہ جبیں:

''.....دوگز زمین خالص سیاسی ہی نہیں ہے۔ بلکہ سماج میں سیاست اور حکومت کس طرح اثر پذیر ہوتی ہے کہ وہ اخلاقیات اور انسانوں کے خیالات کے ساتھ اس کے رہن سہن کے طریقوں کو بھی بدل دیتی ہے۔ان تمام باتوں پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔''(۳۷)

'دوگز زمین' میں عبدالصمد کوئی خاص یا مخصوص کردار کے حوالے سے کہانی کو آگے نہیں بڑھاتے ہیں۔ بلکہ سارے کردار اپنے عہد اور مصائب کا ذکر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔اختر حسین، اصغر حسین، حامد، نازیہ بی بی صاحبہ وغیرہ اس ناول کے خاص اور اہم کردار ہیں۔

عبدالصمد کا فن ان کو دیگر مصنفین سے الگ صف میں کھڑا کر دیتا ہے۔ واقعات کی ترتیب، کہانی کی بُنت، ماحول کی پیش کش اور کرداروں کے برتاؤ کے اعتبار سے 'دوگز زمین' کو خاطر خواہ شہرت ملی۔ ناول نگار نے بڑی خوبی کے ساتھ سیاست کی دوہری شاطرانہ چال کو بھی بے نقاب کیا ہے۔اس ناول میں اظہار کی بے باکی اور لہجے کی توازن کے ساتھ طنز کی آمیزش ناول کے اسلوب کو منفرد بناتی ہے۔عبدالصمد ایسا طنزیہ پہلو اختیار کرتے ہیں کہ قاری کے ذہن کے کسی نہ کسی گوشہ میں جا کر بیٹھ جاتی ہے۔سادگی سے پر ان کی طنزیہ عبارت میں بلا کی کاٹ ہوتی ہے:

''خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے جناح صاحب کو کہ اردو کا ایک لفظ بھی نہیں جانتے تھے، سوائے پاکستان کے،لیکن پاکستان کی زبان اردو بنادی۔''(۳۸)

زبان و بیان کے اعتبار سے 'دوگز زمین' تصنع اور بناوٹ سے پاک ہے۔عبدالصمد نے علامتوں، استعاروں اور تمثیلوں سے بھی کام لیا ہے۔اس حد تک کہ بیانیہ میں پیچیدگی اور ابہام نہ ہو۔

عبداللہ حسین کے ناولوں میں خواتین جس طرح جلوہ گر ہوتی ہیں، وہ انھیں قدرے منفرد بنا دیتا ہے کیوں کہ ان کے متعلق کوئی بھی نہیں جانتا کہ وہ اگلے لمحے کیا کرنے والی ہیں، کدھر کو جانے والی ہیں اور کیا کہنے والی ہیں۔ 'اداس نسلیں' کی 'عذرا' کہتی ہے کہ عورتیں بے شرم نہیں ہوتیں، لیکن محبت ضرور کرتی ہیں۔ وہ خود ہمت اور جسارت کا نمونہ ہے اور ہمیشہ پرعزم لہجے میں بات کرتی ہے۔ اس کی شادی بھی محض اس کی قوت ارادی کے بل بوتے پر ہوتی ہے۔ عبداللہ حسین کے ناولوں کی مرکزی عورت بڑی باحوصلہ اور طاقت و قوت سے بھرپور ہوتی ہے۔ ایسی عورت جب بلند سطح سے اتر کر ایک عام آدمی کو اپنا جیون ساتھی بنائے گی تو اس کی سوچ اپنی بیوی کے لیے وہی ہوگی جو 'اُداس نسلیں' کے نعیم کی ہے۔ عبداللہ حسین کے ناولوں ٹھوس بدن والی عورت ملتی ہے جو اپنے محبوب پر اپنے بدن کے اسرار کا انکشاف کرتی ہے اور اپنی بے تابیوں کا برملا اظہار بھی کرتی ہے۔ درحقیقت عبداللہ حسین کے ناولوں میں عورت کا جو تصور سامنے آتا ہے، وہ غیر معمولی ہے۔ ان کے ہاں عورت کا ذہنی معیار عام عورت سے قطعی مختلف ہیں۔ ان کی عورت حقیقی ماحول میں غیر فطری رویہ اپناتی ہے۔ اس لیے عام طور پر وہ قاری کی ہمدردیاں حاصل نہیں کر پاتی۔ وہ سوچتی ہے اور اچانک فعال ہو جاتی ہے۔ لیکن جلد ہی اپنی حدود میں مقید ہو جاتی ہے۔ اس لیے وہ زندگی میں بھرپور جدوجہد کرتی ہے، تاہم منزل تک نہیں پہنچ پاتی اور راستے ہی میں دم توڑ دیتی ہے۔ عبداللہ حسین کے یہاں مرد عورت کا حق ادا نہیں کر پاتا۔ وہ عورت کو صرف جنسی آلۂ کار بناتا ہے۔ لیکن اسے اپنی زندگی کے لیے اہم نہیں گردانتا۔ یہی وجہ ہے کہ 'اداس نسلیں' کا ہیرو نعیم، عذرا سے کھنچا کھنچا رہتا ہے۔ ان کے ہاں مرد عورت سے سپردگی چاہتا ہے اور اسے اپنی ملکیت سمجھتا ہے۔ اس کی جوانی اور خوبصورتی سے فیض یاب ہوتا ہے۔ مگر اس کے لیے فنا نہیں ہوتا۔ ان کے ناولوں کی عورت کو دیکھتے ہوئے لگتا ہے کہ وفا شعاری، قربانی اور سپردگی کا اس کے لیے اس دنیا میں کوئی انعام نہیں ہے۔

انتظار حسین کے ناولوں کی عورت سماجی اعتقادات کو ساتھ لے کر چلتی ہے۔ نامساعد حالات کے سبب وہ ضعیف الاعتقادی کا شکار بھی ہو جاتی ہے، جس کے نتیجے میں مزاروں پر چراغ جلائے جاتے ہیں۔ منتیں مانی جاتی ہیں۔ گھروں میں مجلسیں منعقد کی جاتی ہیں۔ جہاں خواتین اکٹھی ہوتی ہیں تو یہاں ایک مرتبہ پھر طرح طرح کی باتیں اور افواہیں گردش میں آجاتی ہیں۔ یہ ایسی خواتین ہیں جن کے پاس فرصت ہے۔

تعلیم اور معلومات کی کمی ہے۔اس جہالت اور پس ماندگی کو چھپانے کے لیے دوسروں کی عیب جوئی ان کا بہترین مشغلہ ہے۔انتظار حسین کی عورتوں کا مسئلہ یہ ہے کہ ان کے پاس وقت زیادہ اور کام کم ہے۔ایسے میں اگر کوئی موضوع ان کے ہاتھ لگ جائے تو وہ اس پر بے تکان گفتگو کرتی ہیں۔انتظار حسین کے یہاں ہجرت ایک اجتماعی سانحہ ہے۔کھوئے ہوئے تذکروں کی تلاش،خاندانی نشانیوں اور مذہبی تبرکات کو دھوپ دکھانے کی خواہش،کوئل کی صدا،نیم کے پیڑ کو ڈھونڈنا وغیرہ یہ سب کے سب قدیم کلچر کی علامتیں بن کر سامنے آتی ہیں۔تقسیم سے پہلے کی قصباتی زندگی کا یہی کل اثاثہ تھا۔انتظار حسین کے ناولوں کی بزرگ خواتین جو قدیم روایات کی حامل ہیں اور جنھیں زندگی کے آخری دور میں اپنے گھروں سے بے گھر ہونا پڑا۔وہ نئے ملک اور نئے ماحول میں زیادہ دنوں تک سانس نہ لے سکیں اور ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئیں۔ان کے رخصت ہوجانے پر گھروں میں خاموشی نے ڈیرے ڈال دیے۔بہت عرصے تک ان کی آواز بازگشت کرتی رہی۔یہ خواتین اپنی ذات میں زمانوں کا سنگم تھیں۔ان کے سینے میں اگلے پچھلے کتنے ہی حصے اور کتنی ہی کہانیاں بسی تھیں اور انھیں کے ساتھ دفن ہوگئیں۔انتظار حسین کے ہاں آج کی عورت کو شوہر،مکان اور بنک بیلنس یہ تین چیزیں اسے تحفظ فراہم کرتی ہیں۔آج کی عورت چاہتی ہے،شوہر اس کا مطیع ہو، بنک بیلنس بڑھتا جائے اور مکان ذرا سا پرانا ہونے پر بیچ کر نئے پوش علاقے میں بنایا جائے۔دراصل انتظار حسین کا موضوع وہ معاشرہ ہے جسے وہ چھوڑ آئے تھے اور اس کی بازیابی ہی ان کے تخلیقی ادب کا مقصد ہے۔

عبدالصمد کے یہاں عورت قدیم روایت کی امین بن کر سامنے آتی ہے۔نئی نسل اپنی مالی ضروریات کی تکمیل کے لیے آبائی وراثت کو فروخت کرنا چاہتی ہے تو ماں اس پر راضی نہیں ہوتی۔اس سے اس کا جذباتی انسلاک ہے۔وہ اسی میں اپنے ماضی کو تلاش کرتی ہے۔اسی لیے وہ اس زمین سے اپنا تعلق استوار رکھنا چاہتی ہے۔اس کے باوجود اس کے بیٹے اس احساس کو سمجھ نہیں پاتے اور اسے فروخت کرنے پر اصرار کرتے ہیں۔ماں ممتا کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے لیے راضی ہوجاتی ہے۔تخلیق کار نے یہاں یہ بات ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسان فطری بنیادوں پر ضرب لگا کر اپنی زندگی کو خوش گوار بنانے کی کوشش کرتا ہے۔اس کی بہترین مثال ماں کا کردار ہے۔'دوگز زمین' میں بی بی صاحبہ تینوں ادوار کی چشم دید گواہ تھیں۔وہ کی تقسیم کے خلاف تھیں۔کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ پورے خاندان اور معاشرے کا شیرازہ بکھر جائے گا اور وہی

ہوا۔ پاکستان کے وجود نے سب کچھ تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ یہی ایک گھر متاثر نہ ہوا بلکہ اس طرح کے لاکھوں خاندان بٹ گئے۔ تباہ و برباد ہو گئے۔ بے شمار انسانی جانیں تلف ہوئیں۔ اس تقسیم سے اتنی الجھنیں اور مسائل پیدا ہو گئے جو آج تک حل نہ ہو سکے۔

حواشی

(۱) خالد اشرف: برصغیر میں اردو ناول، ص:۱۶۲

(۲) انور سدید: عبداللہ حسین: اداس نسلیں کا راست فکر ناول نگار، مشمولہ: عبداللہ حسین تخلیقی سفر کی نصف صدی، مرتبہ: احمد سلیم، ص:۵۲

(۳) عبداللہ حسین: اداس نسلیں، ص:۲۴۲

(۴) عبداللہ حسین: اداس نسلیں، ص:۵۹۲

(۵) نورالحسن نقوی: آگ کے دریا سے لہو کے پھول تک، مشمولہ: اردو فکشن، مرتبہ: آل احمد سرور، ۱۹۷۳ء، ص:۱۱۶

(۶) عبداللہ حسین: اداس نسلیں، ص:۳۲۴

(۷) حسن اختر: تنقیدی اور تحقیقی جائزے، ص:۲۱۷

(۸) انور پاشا: ہندو پاک میں اردو ناول، ص:۲۱۸

(۹) عبداللہ حسین: باگھ، ص:۲۰۷

(۱۰) عبداللہ حسین: باگھ، ص:۲۲۷

(۱۱) عبداللہ حسین: باگھ، ص:۲۲۹

(۱۲) عبداللہ حسین: قید، ص:۱۰۰

(۱۳) حسن اختر: تنقیدی اور تحقیقی زاویے، سنگ میل، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص:۲۱۸

(۱۴) سید علی حیدر: اردو ناول سمت اور رفتار، ص:۲۰۳

(۱۵) انتظار حسین: چاند گہن، ص:۱۵۱

(۱۶) انتظار حسین: چاند گہن، ص:۱۳۴

(۱۷) انتظار حسین: چاند گہن، ص:۱۳۴

(۱۸) انتظار حسین: چاند گہن، ص:۱۳۶

(۱۹) انتظار حسین: چاند گہن، ص:۱۰۶

(۲۰) انتظار حسین: چاند گہن، ص:۱۳۴

(۲۱) انتظار حسین: چاند گہن، ص:۱۱۶

(۲۲) انتظار حسین: چاند گہن، ص:۱۱۶

(۲۳) انتظار حسین: چاند گہن، ص: ۱۳۷

(۲۴) انتظار حسین: چاند گہن، ص: ۲۱۵

(۲۵) انتظار حسین: بستی، ص: ۱۶

(۲۶) انتظار حسین: بستی، ص: ۱۱۹

(۲۷) انتظار حسین: بستی، ص: ۲۲۶

(۲۸) انتظار حسین، ایک دبستان، ص: ۶۳۷

(۲۹) صغیر افراہیم: افسانوی ادب کی نئی قرأت، ص: ۲۷

(۳۰) عبدالصمد: دوگز زمین، ص: ۳۶، ۳۵

(۳۱) عبدالصمد: دوگز زمین، ص: ۱۰۴

(۳۲) عبدالصمد: دوگز زمین، ص: ۲۵۱

(۳۳) عبدالصمد: دوگز زمین، ص: ۶

(۳۴) عبدالصمد: دوگز زمین، ص: ۲۲۵

(۳۵) عبدالصمد: دوگز زمین، ص: ۱۸۶، ۱۸۷

(۳۶) قمر رئیس: نیا سفر، مارچ ۱۹۹۰ء، ص: ۷۸

(۳۷) نگینہ جبیں: اردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ، ص: ۱۸۹

(۳۸) عبدالصمد: دوگز زمین، ص: ۲۳۶

○ ○ ○

حاصل مطالعہ

ادیب معاشرے کی آنکھ ہوتا ہے۔اس لئے اس کی تخلیقات اپنے عہد کی عمرانیاتی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ماحول اور واقعات کا اثر ادب پر پڑنا ایک فطری عمل ہے، اور تخلیق کار اس تاثر کی عکاسی اپنے جذبات واحساسات کی آمیزش کے ساتھ کرتا ہے۔

بیسویں صدی کے ابتدائی چند عشرے، برصغیر ہندو پاک کی سیاسی وسماجی تاریخ میں خصوصی اہمیت کے حامل تھے۔اس زمانے میں متحدہ ہندوستان کو دو عالمگیر جنگوں کے علاوہ اور بہت سی سیاسی تحریکوں کا سامنا کرنا پڑا۔خاص طور پر دوسری عالمی جنگ کے بعد ہندوستان میں انگریز سامراج سے آزادی حاصل کرنے کی تحریکیں بہت زیادہ زور پکڑنے لگیں۔ دوقومی نظریے کی گونج پہلے سے کہیں زیادہ بلند سنائی سنائی دینے لگی۔مسلم لیگ اور کانگریس کے رہنماؤں میں سیاسی کشیدگی اپنے عروج پر پہنچ گئی۔شروع شروع میں انڈین نیشنل کانگریس ملک کے بٹوارے کے خلاف تھی،مگر بالآخر مسلم لیگ کے سامنے اسے جھکنا پڑا اور مسلمانوں کی لئے ایک علیحدہ مملکت پاکستان وجود میں آئی۔گویا بیسویں صدی کی چاتھی دہائی اس اعتبار سے بہت زیادہ اہم ثابت ہوئی کہ اس میں نہ صرف ہندوستان کی عوام کو غیر ملکی تسلط سے نجات ملی بلکہ تقسیم ہند کے ذریعہ ایک نیا ملک پاکستان بھی وجود میں آیا۔

لیکن یہ انقلاب جہاں ملت اسلامیہ کے لئے ایک علیحدہ اور آزاد وطن کی نوید لے کر آیا وہاں اس کے دامن میں انسانیت کے لئے بربادیوں اور ذلتوں کے کے طوفان بھی چھپے ہوئے تھے۔متعصب سیاسی لیڈروں نے فرقہ واریت کی آگ روشن کرنے میں دیر نہ کی اور ہندو مسلم فسادات کے الاؤ پورے ہندوستان میں بھڑکنے لگے۔سیاسی تقسیم کے سبب ہجرت کرنے والوں انسانی قافلوں پر ہر دو اطراف سے خون آشام حملے کئے گئے اور انسانی اقدار کو بری طرح پامال کیا گیا۔ یہ تاریخ کا ایسا دردناک المیہ ہے جس نے کل بھی ہر ذی شخص کو خون کے آنسو رلائے اور آج بھی امن واخوت پسند لوگوں کو رنجیدہ وغمگین کئے ہوئے ہیں۔ اسباب چاہے کچھ بھی رہے ہوں مگر انسانی تاریخ نے شاید پہلی بار لاکھوں خاندانوں کا ملک بدر ہونا اور

دوران ملک بدری حیوانیت کے رقصِ برہنہ کا شکار ہونا یا چشم دید گواہ بننا دیکھا تھا۔ یہ وہ بھیانک دور تھا جب شیطانیت نے انسانیت کو اپنے قدموں تلے روند کر پامال کر دیا تھا اور انسانی زندگی اس قدر ارزاں ہوگئی تھی کہ اس کا کوئی خریدار ہی نہیں رہا تھا۔ اس ہیبت ناک دور میں لاکھوں ہندو مسلمان موت کی گھاٹ اتار دئے گئے، ہزاروں دوشیزائیں اغوا کی گئی، ہزاروں کی بے رحمانہ عصمت دری کی گئی اور ان کے مکان اور سامان کو لوٹ کئے گئے تھے۔ موت کی آغوش میں سلانے کے لئے کسی کا صرف ہندو یا مسلمان ہونا ہی کافی سمجھا گیا۔

یہ تقسیم چند خود ساختہ یا نام نہاد مسلم رہنماؤں کے پاگل پن کے نتیجے کے طور پر عمل میں نہیں آیا، بلکہ انیسویں صدی کی ہندو فرقہ پرست عناصر اس سانحے کے زیادہ بڑے مجرم ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی ناکامی صرف انگریزوں کی ہی جیت نہیں تھی بلکہ ان فرقہ پرست ہندوؤں کی بھی جیت تھی جو بہادر شاہ ظفر، رانی لکشمی بائی، بیگم حضرت محل جیسے کشادہ ذہن اور سماجی و مذہبی ہم آہنگی کے پیرووں کی قیادت سامنے آئی تھی جسے انگریزوں نے اپنے ہندوستانی دلالوں کی مدد سے کچل دیا تھا۔ تاریخ گواہ ہے کہ ایک بڑا فرقہ پرست گروہ انگریزوں کی حمایت کر رہا تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ انگریز چلے گئے تو ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت قائم رہے گی۔ جبکہ مجاہدین آزادی کا نظریہ ایک ایسے آزاد ملک کا تھا جہاں مختلف مذاہب کے ماننے والے امن و آشتی کے ساتھ رہ سکیں اور ہندوستان کی دولت کو ایسٹ انڈیا کمپنی اور بعد میں انگریزوں کی حکومت لوٹ کھسوٹ ہمارے ملکی سرمائے کو انگلینڈ میں منتقل کرنے سے روکا جا سکے، یہ صرف ۱۸۵۷ء کے مجاہدین آزادی کی شکست نہ تھی بلکہ ایک سیکولر ہندوستان کی خواب کی بھی شکست تھی۔ یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ دوقومی نظریے کی بنیاد کی ذمہ داری چند فرقہ پرست مسلمانوں کے ذہنی دوالیے پن کا نتیجہ تھی، یہ ماننا تاریخی حقائق کق جھٹلانے کے مترادف ہے۔ ظاہر ہے دوقومی نظریے کی بنیاد گزار ہندو مہا سبھا کی قیادت میں دامودر ساورکر کی ذہنی اختراع کا نتیجہ تھی جسے آگے بڑھ کر لالہ لاجپت رائے جیسے لیڈروں کی سرپرستی حاصل تھی۔ یہی نہیں علامہ اقبال کو بھی اس تقسیم کا ذمہ دار بڑی غیر ذمہ داری کے ساتھ قرار دے دیا جاتا ہے جبکہ علامہ اقبال نے مسلمانوں کے لئے ایک الگ ملک کا مطالبہ قطعی طور پر نہیں کیا۔ نہ ہی محمد علی جناح نے ۱۹۳۷ء سے قبل دوقومی نظریے کی وکالت کی تھی، جناح کا موقف یہ تھا کہ سیاست میں مذہب کی دخل اندازی بالکل نہیں ہونی چاہیے اور اسی نظرے کے تحت انہوں نے گاندھی جی اس فیصلے کی سخت مخالفت کی تھی

کہ خلافت تحریک کو ہندوستان کی تحریک آزادی کے ساتھ جوڑا جائے۔ شاید گاندھی جی اگر جناح کی بات مان لیتے تو مسلم لیگ کی تحریک اتنی طاقت نہ جمع کر پاتی جس کے نتیجے کے طور پر ملک کی تقسیم کا سانحہ عمل میں آیا اور اپنے ساتھ تباہی و بربادی کا سیلاب لے کر آیا۔

ہندوستان کی آزادی اگرچہ یہاں کے باشندوں کے لئے خوشی کا پیغام لے کر آئی، اس نے غلامی کی زنجیر سے ہندوستانیوں کو آزاد کیا۔ لیکن یہ بھی ایک ناقابل فراموش حقیقت ہے کہ ۱۹۴۷ء کے سانحہ نے ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کر کے فرقہ واریت، قومی عصبیت اور منافرت کو تقویت بہم پہنچائی۔ وہیں عورتیں ان فسادات میں سب سے زیادہ متاثر ہوئیں۔ بے شمار عورتوں کو اغوا کیا گیا، شیر خوار بچے اپنی ماؤں کی یاد میں رونے اور بلکنے لگے۔ کئی عورتوں کی گود سونی ہوگئی تو دوسری طرف انسانوں نے وحشی درندوں کا روپ دھار کر دوشیزاؤں کی عصمت دری سے اپنی جنسی ہوس کی بھوک مٹائی۔ انکے آنچل کو داغدار کیا اور پرچم آزادی خون سے لت پت ہوگیا۔ اس طرح پورے ہندوستان میں آگ اور خون کی ہولی کھیلی گئی۔ فرقہ وارانہ نظام قائم ہونے کے بعد ہندوستان کا معاشرتی، معاشی اور تہذیبی و اخلاقی شیرازہ بالکل بکھر گیا۔ سیاسی حالات نے نئے مسائل کو جنم دیا۔ فرد اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگا۔ معاشرے میں متضاد پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔ زندگی کی قدریں بدل گئیں۔ اور ان متغیر قدروں کے درمیان عورتوں کو سب سے زیادہ ظلم و ستم کا نشانا بنایا گیا۔ کیونکہ وہ بے بس، لاچار اور جذباتی طور پر بھی سب سے زیادہ حساس اور کمزور ہوتی ہیں لہٰذا انہیں اس تقسیم میں ملنے والی آزادی کی قیمت اپنی عزت و آبرو سے چکانی پڑی۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ شروعات سے ہی ہر سطح پر عورتوں کو قربانی کی صلیب پر چڑھایا گیا ہے۔

آزادی کے حصول کے ساتھ ہی ملک دو حصوں میں تقسیم ہوگیا اور اس کے ساتھ فرقہ وارانہ فسادات اور انسانی نقل مکانی کے نئے سلسلے شروع ہوگئے۔ اس پورے سانحے نے مختلف شعبۂ زندگی سے وابستہ افراد کو بری طرح متاثر کیا۔ خاص طور سے شاعر و ادیب کو۔ ۱۹۴۷ء کے بعد کے دو دہائیوں میں اردو فکشن میں سب سے زیادہ تقسیم ہند، فرقہ وارانہ فسادات اور ہجرت جیسے مسائل کی عکاسی ہوئی ہے۔ اردو کے بیشتر فکشن نگار 'دو قومی نظریے' اور تقسیم کی سیاست کو ذہنی طور پر قبول نہیں کر پائے۔ ان میں ایسے بھی تخلیق کار تھے جنہوں نے بذات خود اس اندوہناک کرب کو سہا اور اپنی تصنیف کا موضوع بنایا۔ انہیں گنگا جمنی تہذیب کی قوتوں پر اس

قدر شدید ایقان تھا کہ اس کے بکھرنے کا المیہ انہیں اندر تک ہلا گیا۔ رہی سہی کسر فسادات اور اس دوران رونما ہونے والے ہولناک واقعات وحادثات نے پوری کر دی۔ اس عہد میں اردو کا شاید ہی کوئی فکشن نگار ہو جس نے ان موضوعات پر ناول نہیں لکھا ہو۔ ادیبوں نے جہاں مختلف صنف سخن کو اپنا کر تقسیم ہند کے سانحہ کو قلمبند کیا وہیں ناول کے میدان میں بھی اپنے قلم کی جولانیاں دکھائیں اور کئی شاہکار ناول لکھ کر نہ صرف معیار فن کو بلند کیا بلکہ حقیقت کے تلخ تجربات، سماجی شعور، عصری آگہی اور معاشرتی زندگی کی بے مثال آئینہ داری کی۔ اس کے ساتھ ہی فسادات، ہجرت، اقدار کا بحران، نئی اقتصادی اور نفسیاتی تبدیلیاں، نئی تہذیبی مسائل اور سماج کی تشکیل نو کی تقریباً سبھی سطحوں کو اپنے ناولوں میں پیش کیا ہے۔ اور اس طرح تقسیم ہند کے زیر اثر فرقہ وارانہ فسادات اور مہاجرین کے مسائل کا المناک موضوع پر اردو ناول کا ایک مخصوص ذخیرہ قائم ہو گیا۔

آزادی کے بعد ہندو پاک کے ناول نگاروں کے ناول سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ اس عہد میں دونوں ممالک کے کے ناول نگاروں نے اپنے اپنے انداز میں ناول کو فکر وفن کے سانچے میں ڈھال کر پیش کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ اور صنف ناول نگاری کو عصری مسائل اور زندگی کے تقاضوں کو پیش کرنے کی قوت بخشنے کے ساتھ خواتین نے متاثر کن انداز میں اس دور کے کربناکیوں کی حقیقی آئینہ داری کی ہے۔ ان ادیبوں اور فنکاروں میں سرفہرست قرۃ العین حیدر، عبداللہ حسین، انتظار حسین، خدیجہ مستور، رضیہ فصیح، جمیلہ ہاشمی، عبدالصمد، حیات اللہ انصاری، کرشن چندر، شوکت صدیقی، راما نند ساگر وغیرہ خصوصی مقام رکھتے ہیں۔ ان ناول نگاروں نے تقسیم ہند، فسادات اور ہجرت کے اس عظیم سانحے کو بڑے ہی مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔

''اور انسان مر گیا'' میں ہندو مسلم فساد اور ان فسادات میں عورتوں پر ہو رہے ظلم وزیادتی کو بڑے ہی فنکارانہ اور حقیقی پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔ وہیں عبدالصمد کا ناول ''دو گز زمین'' تقسیم ہند کے المیے کیموضوع پر ایک مقبول ناول ہے۔ یہ ناول اپنے دائرے میں تحریک آزادی، سیاسی جماعتوں کی کشمکش سے پیدا شدہ فرقہ وارانہ فسادات، ہندوستان کی تقسیم اور آزادی، قیام پاکستان، مشرقی پاکستان میں مہاجروں اور وہاں کے قدیم باشندوں کا تہذیبی ٹکراؤ، زبان کی بنیاد پر پاکستان کا بٹوارہ، ہندوستانی سیاست کی ابتری اور زمیندارانہ نظام کا زوال جیسے ضمنی موضوع کو سمیٹے ہوئے ہے۔ ناول نگار نے ایک ایک ہی کنبے کی حویلی کو دونوں جماعتوں کا گہوارہ قرار دیا ہے۔ ناول میں یہ حویلی متحدہ ہندوستان کی علامت کے طور پر نمودار ہوئی ہے۔

کرشن چندر کا ناول ''غدار'' اس حقیقت کی آئینہ داری کرتا ہے۔ جو اس عظیم سانحے کے نتائج میں مردوں بالخصوص عورتوں کو جھیلنی پڑی۔ اس ناول میں ہجرت کے دوران قتل وغارت گری کے مناظر کو پیش کیا گیا ہے۔ ناول میں تقسیم ہند کے المیے کے اثرات کی مختلف نوعیتیں موجود ہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات کے دوران ایک قوم کے بلوائی دوسری قوم پر حملہ کرنے میں مختلف حربوں کا استعمال کرتے تھے۔ بعض واقعات تو ایسے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ مفسدوں پر قتل وغارت کا خبط سوار تھا۔ ان کے ناپاک ارادے کو کسی بھی صورت میں ان کے دل سے نکالا نہیں جا سکتا تھا۔ اوروں کی اس سلسلے میں مداخلت تو دور خود ان کی شریک حیات کے مشورے بھی ان کے لئے قابل قبول نہیں ہوتے۔

عبداللہ حسین کا ناول 'اداس نسلیں' پہلی جنگ عظیم سے لے کر قیام پاکستان کے دور تک کا احاطہ کرتا ہے۔ اس ناول میں اس دور کی ہندوستانی سیاست کے سبھی اہم واقعات کو اہمیت دی گئی ہے، لیکن قیام پاکستان اور اس کے نتیجے میں ہجرت کے حادثہ کو جس فنی چابکدستی سے بیان کیا گیا اس سے نہ صرف اس کی جیتی جاگتی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے بلکہ ہجرت کرنے والوں کے المیے کا احساس بھی شدت سے ہونے لگتا ہے۔ قیام پاکستان کا مطالبہ مذہبی بنیادوں پر اٹھایا گیا تھا اور آزادی کے ساتھ ساتھ ملک بھی دو حصوں میں منقسم ہو گیا۔ س میں ہجرت کرنے والوں پر جو گزری اس کی بہت ہی مفصل روداد موجود ہے۔ اس ضمن میں 'اداس نسلیں' کا مقابلہ اردو کا کوئی ناول شاید ہی کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں صرف مہاجروں کے قافلے نیز ہجرت کرنے کے عمل میں عورت پر گزرنے والے واقعات وحادثات کا جائزہ لیا جائے گا۔

ہجرت اور فسادات کے موضوع پر انتظار حسین کا ناول 'بستی' خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس ناول کے کینوس میں مہاجرین کے المناک مسائل ملتے ہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات اور ہجرت کا ذکر ناسٹلجیائی انداز میں تہذیبی سطح پر ہوا ہے جو تقسیم ہند کا ناقابل فراموش المیہ ہے۔ ناول نگار نے ان المناکیوں کو نہایت ہی مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ اس کیفیت کو انتظار حسین نے نہایت ہی کربناک پیرائے میں زیر نظر ناول میں جگہ دی ہے۔ تقسیم ہند کا المیہ نہ صرف اس امر میں ہے کہ ذی شعور اور خوش حال طبقہ ہجرت کے بعد ذہنی اور مالی پریشانیوں میں مبتلا ہوا بلکہ غمناک بات تو یہ ہے کہ ہندوستان میں ہجرت سے قبل امرا اور رؤسا کے دربار میں ملازمت کرنے والے ہجرت کے بعد پاکستان میں اپنی مکارانہ بساط کے مطابق شرنارتھیون کے

مکانوں اور پلاٹوں کو قبضہ کرنے اور الاٹ کرانے میں ہیش پیش رہتے ہیں اور جب کبھی ان کی ہندوستان کے امرا سے ملاقاتیں ہوتی ہیں تو ان کی بے مروتی اور طوطا چشمی انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔اس ناول میں ان تمام مسائل کو اجاگر کیا گیا ہے۔

مردوں کی طرح خواتین ناول نگار نے بھی تقسیم ہند کے خونچکاں سانحہ کو بڑے ہی مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔فسادات اور ہجرت سے متاثر ہو کر عمدہ شہپارے تخلیق کی ہیں۔ان کی تحریروں میں جذبات واحساسات کی وہ رو دکھائی دیتی ہے جسے ہم اعلیٰ درجے کی حقیقت نگاری اور ذاتی واردات سے تعبیر کر سکتے ہیں۔تقسیم ہند کے پس منظر میں لکھے گئے ناولوں میں خواتین ادیبوں نے جو کردار ابھارے ہیں وہ مرد ناول نویسوں سے کسی طور کم نہیں۔فسادات وہجرت کے موضوع پر ان ہوں نے دراصل انسانی ضمیر کو جھنجھوڑا ہے۔ اسے خواب غفلت سے جگایا ہے۔تا کہ انسانیت کی آخری سان س نکلنے سے پہلے اسے ہوش آجائے۔درد مندی کے جذبات سے پُر۔کبھی تلخی کی حدوں کو چھوتے ہوئے تو کبھی پچھتاوے کے انداز میں۔خاتون ادیبوں کے ناول صرف اپنے آپ کو مہذب کہلانے والے انسان کو آئینہ دکھاتے ہیں۔کیونکہ یہ ناول محض ۱۹۴۷ء کے فسادات اور ہجرت کی ایک متحرک فلم ہی نہیں ہی ہے بلکہ آنے والے زمانوں کے انسان کے لئے ایک عبرت بھی ہیں۔یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ہزاروں برس کی مسلسل محنت سے مذاہب اور اخلاقی اداروں نے تہذیبی اقدار کی جو اونچی دیواریں کھڑی کی ہیں وہ ایک ہی لمحہ کی بھول سے گر بھی سکتی ہیں۔ انسان کو ابھی ''سوشل اینی مل'' کہنا مناسب نہیں۔یہ خطاب ابھی اس کیلئے قبل از وقت ہے۔چونکہ ابھی تک تو یہ صرف اینی مل ہی ہے۔سوشل ہونے کے لئے ابھی اسے کئی زمانے درکار ہیں۔

خواتین ناول نگار میں ''قرۃ العین حیدر'' اور جیلانی بانو کے ناولوں میں تقریباً تمام مسائل ملتے ہیں۔ان کے ناولوں میں تقسیم ہند موضوع کی شکل میں ابھرتی ہے۔اس سلسلے میں قرۃ العین حیدر کی بیش تر ناول تقسیم ہند، فسادات اور ہجرت کی تمام ہولنا کیوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔''میرے بھی صنم خانے''، ''سفینۂ غم دل''، ''آگ کا دریا''، ''آخر شب کے ہمسفر''، ''کار جہاں دراز ہے''۔ان سبھی ناولوں میں تقسیم کا المیہ انسانی حادثہ کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔خود قرۃ العین حیدر تقسیم ہند کے المناک حادثہ سے بے حد متاثر تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تقریباً سبھی ناولوں میں اس المناک حادثہ کی سسکتی ہوئی آواز سنائی دیتی ہے۔قرۃ العین

حیدر کے تمام ادبی تخلیقات میں ''آگ کا دریا'' اہم مقام رکھتا ہے۔ یہ ناول قدیم ہندوستان کی تہذیب و تمدن سے لے کر تقسیم ہند اور قیام پاکستان کے تمام حالات و واقعات کا احاطہ کرتا ہے۔ اس طرح یہ ناول ڈھائی ہزار سالہ تاریخ کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ تقسیم کے المیے کو سمجھنے کے لئے قرۃ العین حیدر نے اپنے ناولوں میں چند کرداروں کی سیرت پیش کرنے میں اپنی فن کاری کی ایسی جوت جگائی ہے تقسیم کے ناولوں کا ذکر ہوتے ہی ان کے کرداروں کے خدوخال قاری کے ذہن میں ابھرنے لگتے ہیں۔ ''میرے بھی صنم خانے'' کی رخشندہ، ''آگ کا دریا'' کی چمپا، چمپا بائی، چمپاوتی، چمپک اور ''آخر شب کے ہم سفر'' کی دیپالی سرکار اور یاسمین بلمونٹ متعلقہ ناولوں کی نمائندہ کردار ہیں جو تقسیم ملک، فسادات اور ہجرت کی المناکیوں کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔

خدیجہ مستور نے بھی تقسیم وطن کے سانحے سے گزر کر اپنے دور کی سماجی، سیاسی اور تہذیبی تبدیلیوں کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ تقسیم وطن کے بعد تبادلہ آبادی، مہاجرین کے لئے نئے ملک کے مسائل، اور فسادات کی کربناکی ان کی کہانیوں کا موضوع بنے ہیں۔ اور ان کہانیوں میں خدیجہ مستور نے نہایت شدید ردعمل کا اظہار کیا ہے۔ اس وقت انسانی زندگی میں جو پیچ وخم، شکست وریخت تخریب وتعمیر کی بنیاد پڑی ہوئی تھی۔ یہ سارے مسائل دوسرے ناول نگاروں کی طرح خدیجہ مستور نے بھی پیش کیا ہے۔ ''آنگن'' اور ''زمین'' خدیجہ مستور کے عمدہ ناول ہیں جو افسانوی ادب میں شاہکار کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ ناول نگار نے عورتوں کی سماجی اور معاشی حیثیت ومقام، ان کی تکالیف اور زوال آمادہ جاگیرداری معاشرت سے پیدا شدہ عورتوں کی زندگی کی کشمکش کو اجاگر کیا ہے۔ آنگن میں زوال پزیر زمینداروں کی طرز زندگی اور اس ماحول میں پلنے والے مختلف رویوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔ جہاں متوسط طبقے کی عورتیں معمولی معمولی مسائل سے گھری ہوئی ہیں۔ سماج کی محرومیاں، بے بسی اور گھٹن، عورتوں کی زندگی میں رچ بس گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خدیجہ مستور نے عام عورتوں کی لاچاری اور نفسیاتی کشمکش کی تمام وجوہات کو نمایاں کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ ''زمین'' خدیجہ مستور کی ایک بہتری کاوش ہے۔ جس میں تقسیم ہند، فسادات اور ہجرت کے کرب کو اس کے حقیقی تناظر مین پیش کیا گیا ہے۔ ''زمین'' کو بھی ایک کاندان کے چند افراد کے ذکر سے قیام پاکستان کے ابتدائی زمانے کی ایک دستاویز میں بدل دیا گیا ہے۔ پس منظر میں برطانوی حکومت سے آزادی کے لئے جمہوری تحریک کا

بیان ہے۔ پھر فسادات اور ہجرت کے بعد کیمپوں کی زندگی کا ذکر ہے اور ازاں بعد قصے کا اہم ترین حصہ آجاتا ہے۔، جس میں ایک گھر کے حوالے سے نئے پاکستانی معاشرے میں موجود متضاد طبقوں کی کشمکش اور سماجی رویوں کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

جمیلہ ہاشمی کا ناول'' تلاش بہاراں'' آزادی کے بعد لکھے جانے والے اہم ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔آزادی کے بعد برصغیر ہندو پاک میں جس طرح نئی زندگی اور نئے معاشرے کے خواب دیکھے گئے،'' تلاش بہاراں'' اسی کی ایک تصویر ہے۔اس ناول کی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں معاشرے میں خواتین کی موجودہ صورتحال کو بہتر بنانے کی کوششوں کا پتہ چلتا ہے۔جس عہد می عکاسی اس ناول میں ملتی ہے اس دور کی مشرقی عورتوں کے حالات نہایت سنگین نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے ناول میں نسوانی کردار کثیر تعداد میں موجود ہے۔کنول کماری ٹھاکر، کرشنا، شوبھا، بینا اور نیرا وغیرہ اس ناول کے اہم کردار ہیں جس میں مرکزیت کنول کماری ٹھاکر کو حاصل ہے۔اس ناول میں ہر طبقے کی عورتوں کی طرز معاشرت اور ان کے گونا گوں مسائل کو بیان کیا گیا ہے۔لیکن سب سے زیادہ جمیلہ ہاشمی نے جس چیز کو اجاگر کیا ہے وہ ہندوستانی سماج میں عورت کی مظلومیت اور اس کے استحصال کی دردناک کہانی ہے۔ناول کا کوئی کردار ایسا نہیں جو آزدی کی جدوجہد میں شامل نہ ہو۔ جمیلہ ہاشمی نے اپنے وسیع تجربات، عمیق مشاہدات اور روشن خیالی کا مکمل ثبوت پیش کیا ہے۔ اور تقسیم سے قبل ہند پاک کے دانشور طبقے کی ذہنی، جذباتی اور نفسیاتی کیفیت کا اظہار اپنے کرداروں کے ذریعہ کیا ہے۔ جمیلہ ہاشمی عورتوں کے جذبات واحساسات کی ترجمانی بے حد دلکش انداز میں کیا ہے اور معاشرے بوسیدہ رسم ورواج اور ضعیف العتقادی کا مذاق بھی اڑایا ہے۔جس میں درد بھی ہے اور تڑپ بھی۔ جسے پڑھ کر قاری بے اختیار کراہ اٹھتے ہیں اور سماج کی اس بے حسی اور خودغرضی پر از سرنو غور وفکر کرتے ہیں۔ بلاشبہ'' تلاش بہاراں''، تقسیم ہند، فسادات اور عورتوں کی سماجی صورتحاک کی بہترین مثال ہے۔

الغرض تقسیم ہند کے المیے نے سماج اور اس سے وابستہ دیگر شعبے وادارے کو شدید طور پر متاثر کیا۔ جس میں ادب بھی شامل تھا۔ تقسیم ہند کے حادثات وواقعات کا سب سے مؤثر اظہار اردو ادب کے ذریعے ہی ہوا۔اس عہد میں برپا ہونے والے فسادت اور اس کی ہولنا کیوں کو تمام تخلیق کاروں نے اپنی تخلیق کا موضوع بنایا۔اس موضوع پر جتنے بہترین فن پارے اردو زبان وادب میں تخلیق ہوئے وہ کسی ہندوستانی

زبان میں نہ ہوسکا۔فسادات،قتل وغارت گری اورزبردست تباہی کا احساس تمام ادیبوں اوردانشوروں کے دل ودماغ میں شدت سے پیدا ہوا۔منٹو، بیدی، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، عصمت چغتائی، عبداللہ حسین، کرشن چندر، حیات اللہ انصاری، راماننند ساگر، خدیجہ مستور، جمیلہ ہاشمی، عبدالصمد وغیرہ ادیبوں کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جن کے ذہن میں یہ اندوہناک واقعہ اس طرح سے رچ بس گیا تھا، جس کی شدت کوانہوں نے تصنیف وتخلیق کی صورت میں پیش کیا۔

○○○

کتابیات

کتابیات

بنیادی مآخذ

- جمیلہ، ہاشمی، تلاش بہاراں، اردو اکادمی سندھ، کراچی، ۱۹۶۱ء
- حسین، انتظار، بستی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۴ء
- حسین، انتظار، چاند گہن، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، ۲۰۱۳ء
- حسین، عبداللہ، اداس نسلیں، اردو پبلشرز، دہلی، ۱۹۸۲ء
- حیدر، قرۃ العین، آخر شب کے ہم سفر، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۸۴ء
- حیدر، قرۃ العین، آگ کا دریا، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۴ء
- حیدر، قرۃ العین، میرے بھی صنم خانے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰ء
- عبدالصمد، ''دوگز امین''، نصرت پبلشرز لکھنؤ، ۱۹۹۳ء
- مستور، خدیجہ، آنگن، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۳ء
- مستور، خدیجہ، زمین، ہمالیہ بک ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۴ء

ثانوی مآخذ

- ابوالحسن، آمنہ، ''سیاہ سرخ سفید''، نیشنل بک ڈپو، حیدرآباد، ۱۹۶۸ء
- احمد، عقیل، ''اردو ناول اور تقسیم ہند''، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۷ء
- احمد، کلیم الدین، ''اردو زبان اور فن داستان گوئی''، سرفراز پریس لکھنؤ، ۱۹۶۵ء
- احمد، رضیہ فصیح، ''آبلہ پا''، مکتبہ علم وفن، دہلی، ۱۹۶۵ء
- اختر، جمیل، ''عصمت چغتائی کی نقد کی کسوٹی پر''، انٹرنیشنل اردو فاؤنڈیشن، نئی دہلی، ۲۰۰۱ء

- اردو اکادمی دہلی، ''اردو ادب کو خواتین کی دین''، ثمر آفسیٹ پریس، نئی دہلی، ۱۹۹۴ء
- اشرفی، وہاب، ''مابعد جدیدیت، مضمرات و ممکنات''، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۴ء
- اشرف، ڈاکٹر خالد، ''برصغیر میں اردو ناول''، پیتم پورہ، دہلی، ۱۹۹۴ء
- اعظمی، خلیل الرحمٰن، ''اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک''، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۴ء
- افراہیم، صغیر، ''اردو فکشن، تنقید اور تجزیہ''، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۳ء
- انصاری، حیات اللہ، ''لہو کے پھول''، کتاب داں، لکھنؤ، ۱۹۷۰ء
- انصاری، اسلوب احمد، ''اردو کے پندرہ ناول''، یونیورسل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۳ء
- انور، خورشید، ''قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں تاریخی شعور''، انجمن ترقی اردو، نئی دہلی، ۱۹۹۳ء
- ایوب، ہارون، ''اردو ناول پریم چند کے بعد''، اردو پبلشر، لکھنؤ، ۱۹۷۸ء
- آزاد، ابوالکلام، ''ہماری آزادی''، اورینٹ لونگ مین لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۹۱ء
- آزاد، اسلم، ''آزادی کے بعد اردو ناول''، ڈی لکس پریس، نئی دہلی، ۱۹۹۳ء
- بانو، قدسیہ، ''راجہ گدھ''، شان ہند پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۱۹۸۸ء
- بانو، جیلانی، ''ایوان غزل''، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۷۶ء
- بخاری، پطرس، ''تنقیدی مضامین''، ادبی دنیا ٹیا محل، دہلی، ۱۹۸۳ء
- بخاری، سہیل، ''اردو ناول نگاری''، الحرا پبلشرز، دہلی، ۱۹۷۳ء
- بیدی، راجندر سنگھ، ''ایک چادر میلی سی''، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۰۸ء
- پاشا، انور عالم، ''تانیثیت اور ادب''، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، ۲۰۱۴ء
- پاشا، انور عالم، ''ہندو پاک میں اردو ناول''، پیش رو پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۱۹۹۲ء
- پرساد، بینی، ''ہندوستان کا قدیم تمدن'' (ترجمہ)، ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد، ۱۹۵۰ء
- پرویز، اطہر، ''ادب کا مطالعہ''، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۶ء
- پروین، اظہر، ''اردو میں مختصر افسانہ نگاری کی تنقید''، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۰ء
- تاجور، درخشاں، ''ہندوستان کی جدوجہد آزادی پر ایک نظر''، گورکھپور، ۱۹۹۱ء
- تحسین، آمنہ، مطالعات نسواں''، ایضاً، ۲۰۰۸ء
- تحسین، آمنہ، ''تانیثی فکر کی جہات''، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۲ء
- جالبی، جمیل، ''ادب کلچر اور مسائل'' (مرتبہ: خاور جمیل)، رائل بک کمپنی، کراچی، ۱۹۸۶ء

- جبیں، نگینہ، ''اردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ: ۱۹۴۷ء اور اس کے بعد''، کیشو پرکاشن، الہ آباد، ۲۰۰۲ء
- جعفری، سردار، ''ترقی پسند ادب''، انجمن ترقی اردو (ہند)، علی گڑھ، ۱۹۷۵ء
- جوشی، پی سی ''انقلاب اٹھارہ سو ستاون''، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۳ء
- جہاں، قیصر، ''اردو میں نسائی ادب کا منظر نامہ''، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۲۰۰۴ء
- چغتائی، عصمت، ''معصومہ''، نیا ادارہ، لاہور
- چندرا، بپن، ''جدید ہندوستان''، این سی ای آر ٹی، نئی دہلی، ۱۹۷۹ء
- چندرا، ستیش، ''ہندوستان کا عہد وسطیٰ'' (حصہ اول)، این سی آر ٹی، نئی دہلی
- چندر، کرشن، غدار، پبلشرز کملا چوپڑہ''، دہلی، ۱۹۶۷ء
- چند، تارا، ''اسلام کا ہندوستان پر اثر'' (ترجمہ)، چودھری آزاد کتاب گھر، کلاں محل، دہلی، ۱۹۸۵ء
- چند، تارا، ''تاریخ تحریک آزادئ ہند''، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ۲۰۰۵ء
- حسرت، عبدالحق، ''خدیجہ مستور: بحیثیت ناول نگار''، اعجاز پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۸ء
- حسن، فاطمہ ''فیمینزم اور ہم''، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۲۰۰۵ء
- حسن، محمد، ''جدید اردو ادب''، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۷۵ء
- حسین، احتشام، ''ذوق ادب اور شعور''، ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ، ۱۹۶۳ء
- حسین، رفیق، ''اردو ناول کی نشو ونما آزادئ ہند کے تناظر میں''، الہ آباد، ۱۹۸۷ء
- حسین، سبط، ''پاکستان میں تہذیب کا ارتقا (حصہ دوئم)''، مکتبہ دانیال، کراچی، ۱۹۸۶ء
- حسین، سید عابد، ''ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں''، عابد حسین میموریل ٹرسٹ، دہلی، ۱۹۹۱ء
- حسین، صالحہ عابد، ''فن اور فنکار''، مصنف، ۱۹۹۰ء
- حسین، مجتبیٰ، ''ادب اور آگہی''، مکتبہ افکار، کراچی
- حسین، ممتاز، ''خدیجہ مستور: بحیثیت ناول نگار''، اعجاز پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۱۹۸۸ء
- حنا، زاہدہ، ''عورت زندگی کا زنداں''، تخلیق کار پبلشر، دہلی، ۲۰۰۶ء
- حیدر، قرۃ العین، ''سفینۂ غم دل''، مکتبہ جدید، لاہور، ۱۹۵۲ء
- خان، احمد ممتاز، ''اردو ناول کے بدلتے تناظر''، ویلکم بک پورٹ، کراچی، ۱۹۹۳ء
- خان، عبدالودود، مولانا ابوالکلام آزاد: ''تحریک آزادی اور یکجہتی''، دہلی، ۱۹۸۳ء
- خورشید الاسلام، ''تنقیدیں''، انجمن ترقی اردو ع ہند، علی گڑھ، ۱۹۶۴ء

- خورشیدالاسلام، ''اردوادب آزادی کے بعد''، علی گڑھ، ۱۹۷۳ء
- ذکی، صادقہ، ادب، ''خواتین اورسماج''، لبرٹی آرٹ پریس، دہلی، ۱۹۹۴ء
- ردولوی، شارب، ''جدیداردوتنقیداصول اورنظریات''، اردوا کادمی، لکھنؤ، ۱۹۸۱ء
- رئیس، قمر، ''تنقیدی تناظر''، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۷۷ء
- ریاض، ترنم، ''بیسویں صدی میں خواتین کا اردوادب''، ساہتیہ اکادمی، دہلی، ۲۰۰۴ء
- زریں، صالحہ، ''اردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ: ابتدا سے ۱۹۴۷ء تک'' (رحم علی ہاشمی)، سرسوتی پریس، الٰہ آباد، ۲۰۰۰ء
- ساگر، رامانند، ''اورانسان مرگیا''، ہند پاکٹ بکس، دہلی
- سدید، انور، ''اردوادب کی تحریکیں''، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۸۵ء
- سرور، آل احمد، ''اردوفکشن''، یونیورسٹی پبلی کیشنز، علی گڑھ، ۱۹۷۳ء
- سرور، آل احمد، ''تنقیدی اشارے''، مسلم ایجوکیشنل پریس، علی گڑھ
- سرور، آل احمد، ''جدیدیت اورادب''، نیشنل آرٹ پریس، الہ آباد، ۱۹۴۹ء
- سلطانہ، رفیعہ، ''اردوادب کی ترقی میں خواتین کا حصہ''، حیدرآباد، ۱۹۶۱ء
- شرما، رام شرن، ''قدیم ہندوستان''، این سی ای آر ٹی، نئی دہلی، ۱۹۸۳ء
- شمیم، نکہت، ''پریم چند کے ناولوں میں نسوانی''، نصرت، پبلشرز، لکھنؤ، ۱۹۷۵ء
- شیروانی، ''افتخار، عورتوں کی محکومیت''، فیروزسنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، کراچی، ۱۹۹۳ء
- شیریں، ممتاز، ''معیار''، نیاادارہ، لاہور، ۱۹۶۲ء
- صدیقی، ابواللیث، ''آج کا اردوادب''، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۶ء
- صدیقی، عبدالسلام، ''کرشن چندر کے ناولوں کا تنقیدی مطالعہ': ثقافت اور سیاسی پس منظر میں، انجمن ترقی اردو، دہلی، ۲۰۰۴ء
- عابدی، خورشید زہرہ''، ترقی پسند افسانے میں عورت کا تصو'ر، جے آر آفسیٹ پرنٹرز، دہلی، ۱۹۸۷ء
- عباس، خواجہ احمد، ''انقلاب''، نیا سنسار، بمبئی، ۱۹۷۵ء
- عباسی، قاضی محمد عدیل ''تحریک خلافت'' قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۱۹۹۷ء
- عبدالستار، قاضی، ''شب گزیدہ''، مکتبہ فسانہ، الہ آباد، ۱۹۶۸ء
- عبدالسلام، ''اردو ناول بیسویں صدی میں''، اردوا کادمی ہند، دہلی، ۱۹۷۲ء

- عبدالمغنی، ''قرۃ العین حیدر کا فن''، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۵ء
- عتیق اللہ، مرتب: ''بیسویں صدی میں خواتین اردو ادب''، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۲ء
- عظیم، وقار، ''داستان سے افسانے تک''، اردو اکادمی سندھ، کراچی، ۱۹۶۰ء
- عظیم، وقار، ''نیا افسانہ''، اردو اکادمی سندھ، کراچی، ۱۹۵۷ء
- علوی، خالد، ''انگارے کا تاریخی پس منظر''، مصنف، ۱۹۹۵ء
- علی، مشرف، ''جیلانی بانو کی ناول نگاری کا تنقیدی مطالعہ''، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۳ء
- عمری، سید جلال الدین، ''عورت اسلامی معاشرے میں''، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ۱۹۸۴ء
- غیاث الدین، محمد شیخ، ''جہات جہد آزادی''، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۸ء
- فاروقی، احسن اور نورالحسن ہاشمی، ''ناول کیا ہے''، نعیم بک ڈپو، لکھنؤ، ۱۹۶۰ء
- فاروقی، احسن، ''ادبی تخلیق اور ناول''، مکتبہ اسلوب، کراچی، ۱۹۶۳ء
- فاروقی، احسن، ''اردو ناول کی تنقیدی تاریخ''، ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ، ۱۹۶۲ء
- فاروقی، احسن، ''سنگم''، لبنیٰ پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۷۱ء
- فاطمی، علی احمد، ''نئی تنقید، نئے اقدار''، سرسوتی آفسیٹ پریس، الہ آباد، ۱۹۹۹ء
- فتحپوری، فرمان، ''اقبال سب کے لئے''، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۱ء
- فرزانہ، نیلم، ''اردو ادب کی اہم خواتین ناول نگار''، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۲ء
- فضل، سیمی ثمر، ''ہندوستانی مسلم خواتین کی جدید تعلیمی ترقی میں ابتدائی ناولوں کا حصہ''، اے ون فوٹو آفسیٹ، دہلی، ۱۹۹۱ء
- قاسمی، ابوالکلام، ''آزادی کے بعد اردو فکشن'': مسائل و مباحث، ساہتیہ اکادمی، دہلی، ۲۰۰۱ء
- قاسمی، ابوالکلام، ''ناول کا فن''، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۲ء
- کبیر، فہمیدہ، ''اردو ناول میں عورت کا تصور نذیر احمد سے پریم چند تک''، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۹۲ء
- کریم، ارتضیٰ، مرتبہ: ''قرۃ العین حیدر: ایک مطالعہ''، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۲ء
- کریم، ارتضیٰ، ''اردو فکشن کی تنقید''، تخلیق کار پبلشرز، نئی دہلی، ۱۹۹۶ء
- کنول، کشن پرشاد، ''نیا ادب''، انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۱۹۴۹ء
- گوپی چند نارنگ، ''اردو افسانہ روایت اور مسائل''، ایجوکیشنل پبلشنگ کمپنی
- گورکھپوری، مجنوں، ''ادب اور زندگی، اردو ادب''، علی گڑھ، ۱۹۶۴ء

- گیلانی، سید اسد، ''عورت اور اسلامی انقلاب''، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ۱۹۹۹ء
- مرزا شہنشاہ، ''قرۃ العین حیدر کی ناول نگاری''، لکھنؤ، ۱۹۸۹ء
- مہدی، صغرا، ''ہندوستان میں عورت کی حیثیت''، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۰ء
- مہدی، صغرا، ''اردو ناولوں میں عورت کی سماجی حیثیت''، سجاد پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۰۲ء
- ناہید، کشور، ''عورت خواب اور خاک کے درمیان''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء
- ناہید، کشور، ''عورت اور مرد کا رشتہ''، ادب پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۴ء
- نسیم، محمد، ''اردو ناول پر تقسیم ہند کے المیے کے اثرات''، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۲ء
- وانی، مشتاق احمد، ''تقسیم ہند کے بعد اردو ناول میں تہذیبی بحران''، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۲ء
- وانی، مشتاق احمد، ''اردو ادب میں تانیثیت''، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۳ء
- یٰسین، محمد، ''انگریزی ادب کی مختصر تاریخ''، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۲ء

رسائل و جرائد

- ایوان اردو، قرۃ العین نمبر، اردو اکادمی، دہلی، ۲۰۰۸ء
- آج کل، خواتین نمبر، شمیم نکہت، آزادی نسواں کی جدوجہد، ۱۹۷۵ء
- آج کل، نجمہ آوری، اسلام میں عورتوں کا درجہ، (خواتین نمبر)، اگست۔ستمبر، ۱۹۷۵ء
- آج کل، نرگس سلطانہ، اردو میں نسائی ادب، جون، ۲۰۰۵ء
- آجکل (ماہنامہ)، ادب اور سیاست، دہلی، اکتوبر، ۱۹۴۸ء
- آجکل، خواتین نمبر، نئی دہلی، اگست، ۱۹۷۵ء
- پاکستانی ادب، ریاض صدیقی، خواتین اہل نظر اور فیمنسٹ شعور، اسلام آباد، ۱۹۹۵ء
- پہچان، نسائیت کی تحریک اور اردو ادب، ضمیر علی بدایونی / ترجمہ فاطمہ حسن: الہ آباد، ۲۰۰۷ء
- ترجیحات، تانیثیت ایک سیاقی مطالعہ، عتیق اللہ: دہلی، ۲۰۰۲ء
- ذہن جدید، سہ ماہی: ''فسادات کے افسانے''، جلد: ۴، شمارہ ۱۴ دسمبر ۱۹۹۳ء تا فروری ۱۹۹۴ء
- روشنائی (سہ ماہی) گوشۂ عبدالصمد، کراچی، اپریل تا جون، ۲۰۰۱ء

- شاعر، تانیثی جمالیات کا تعیّن، عتیق اللہ: ممبئی، جولائی ۲۰۰۴ء
- شاعر، ریاض صدیقی، فیمنسٹ ادب کا مسئلہ،
- شاعر، قرۃ العین حیدر نمبر، جلد ۴۹ شمارہ ۷، بمبئی، ۱۹۷۸ء
- شاعر، بمبئی، ماہنامہ: ''کرشن چندر نمبر''، ۱۹۶۷ء
- عصری آگہی، قمر رئیس، اکتوبر، ۱۹۷۹ء
- فکر و نظر، تحریک آزادی نمبر، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۵ء
- قومی زبان، کراچی، ماہ نامہ جولائی، ۱۹۹۵ء
- کتاب نما، رعنا اقبال، اقبال اور نسائی حقوق کا تصور، بمبئی، اکتوبر، ۲۰۰۰ء
- نیا سفر، عتیق اللہ، تانیثیت ایک تنقیدی تھیوری، ۱۹۹۴ء
- نیا دور، یادگار آزادی نمبر، لکھنو، اگست، ۱۹۹۷ء
- نیا دور، سہ ماہی: ''فسادات نمبر''، مارچ ۱۹۴۹ء

English Books

- Advent of Independence, by A.K.Majumdar, Bhartiya Vidya Bhawan, Chowpatty, Bombay1963
- Awasthi, A.K.Shrivastava, Rawat publication, jaipur, 2001
- Feminism,theory,criticism,analysis: Shushila Singh, Pen Craft International, New Delhi, 2004
- Feminism approach to religion: S.M.Channa,Cosmo pub. New Delhi,2004
- Feminist perspective on environment and society: Beate Litting,England,2001
- Freedom Movement In India,The role of ali brothers: by Shan Mohammad, Delhi
- Freedom Struggle, by Bipan Chandra,Amalesh Tripathi, Barun De:N.B.T, Delhi 1972

- History of the freedom movement in India, By:Tara Chand,Publication Division M.I.B.Govt. of India, 1972
- Modernity Feminism and woman empowerment: Abha
- The Evolution of India and Pakistan(1855-1947By: B.N.Pandey, Oxford University Press, New York,1962
- Women in the past, present & future: August Bell, NBT, New Delhi, 197

❍ ❍ ❍

Taqseem-e-Hind, Fasadaat Aur Hijrat Ka Taaneesi Mutala
(Numaainda Nawilon Ke Hawale Se)

A Feminist Study of Partition of India, Communal Riots and Migration (With Special Reference to Representative Novels)

Thesis submitted to the Jawaharlal Nehru University in Partial fulfillment of the requirements for the award of the degree of

DOCTOR OF PHILOSOPHY

Submitted By

FARHEEN KAUSHER

Supervisor

PROF. S.M. ANWAR ALAM

(Anwar Pasha)

Centre of Indian Languages

School of Language, Literature and Culture Studies

Jawaharlal Nehru University

New Delhi, 110067

2019